# فہرست

**لمعات:**


| | | |
|---|---|---|
| کیا نفاذِ اسلام کے لئے ہر طریقہ جائز ہے؟ | | 3 |
| نماز کی اہمیت | غلام احمد پرویز | 5 |
| فنا اور بقا | جمیل احمد عدیل، بورے والا | 9 |
| حضرتِ انسان قرآن کے آئینے میں | آصف جلیل، کراچی | 21 |
| ایک آیہ کریمہ کی مذہبی اور دینی تفسیر | خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی، کراچی | 26 |
| قرآنی فہمی یا قرآن خوانی | ڈاکٹر محمد امین ضیاء، فیصل آباد | 34 |
| مطالب القرآن فی دروس الفرقان (۲۹واں پارہ) | غلام احمد پرویزؒ | 37 |
| بایزید یلدرم (تبصرہ) | محمد سلیم اختر، لاہور | 57 |
| یومِ مئی (نظم) | حیات رضوی امروہوی، کراچی | 58 |

**ENGLISH SECTION**

**Paradoxical Justice**
(Federal High Court Judge sent to jail)
By Abdur Rashid Samnakay, Australia 1


## حدیث نبوی ﷺ

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے جس میں تمہارے درمیان (حرام وحلال یا طاعت وگناہ وغیرہ کا) حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قولِ فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا ہلاک کرے گا اس کو اللہ۔۔۔ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی گمراہ کرے گا اس کو اللہ۔۔۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔ (بحوالہ مشکوٰۃ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

## کیا نفاذِ اسلام کے لئے ہر طریقہ جائز ہے؟

جو جماعت کسی مستقل قدر یا غیر متبدل اصول کی پابند نہیں ہوتی' وہ اپنے نظام کو نافذ کرنے کے لئے جو طریق بھی چاہے اختیار کر سکتی ہے۔ ان کے نزدیک طریق کار کے جائز یا ناجائز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو طریق بھی حصولِ مقصد کے لئے مدد و معاون ہو' وہ ان کے ہاں جائز قرار پاتا ہے۔ ان کے نزدیک طریق کار کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ (-By the ends achieved means are justified-)۔ دورِ حاضر میں اس کا زندہ ثبوت مارکسزم اور لینن ازم ہے جن کے نزدیک' لوٹ مار' توڑ پھوڑ' قتل و غارت گری' دنگہ فساد اور اس کے ساتھ جھوٹ' فریب' مکاری' عیاری' سازش وغیرہ نہ صرف جائز بلکہ نہایت مستحسن طریقے ہیں۔۔۔ مارکسزم کا یہ فلسفہ' اس حد تک اثر انگیز ہو چکا ہے کہ جو جماعتیں اس کی مخالفت کے لئے سامنے آتی ہیں' طریقِ کار وہ بھی اسی قسم کا اختیار کر لیتی ہیں۔

ان کے برعکس جو جماعت مستقل اقدارِ حیات اور غیر متبدل اصولوں پر ایمان رکھتی ہے' اس کے نزدیک ذرائع اور مقصد میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد بھی حق پر مبنی ہوتا ہے اور وہ اس کے حصول کے لئے ذرائع اور طریقے بھی وہی اختیار و استعمال کر سکتی ہے جو مبنی برحق ہوں۔ وہ اس حقیقت پر یقین رکھتی ہے کہ غلط راستہ اور طریقہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ لہٰذا' جو جماعت قرآن کا معاشی نظام نافذ کرنا چاہے وہ کبھی کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کر سکتی جو قرآن کی رو سے غلط/ باطل ہو اور لوٹ مار' قتل و غارت گری' خلفشار' انتشار وغیرہ قرآن کے نزدیک سخت مذموم اور جھوٹ' فریب' مکاری' عیاری بدترین جرائم ہیں۔ وہ اس طریق کار کو فسادؔ قرار دیتا ہے اور مفسدین' اس کے نزدیک بدترین خلائق ہیں۔ اس کا طریق ''انقلاب'' ہے' فساد نہیں اور ان دونوں میں جو بنیادی فرق ہے اس کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے' بالخصوص اس لئے کہ آج کل بدقسمتی سے فساد ہی کو انقلاب کہہ کر پکارا جا رہا ہے' حالانکہ جسے ''انقلاب زندہ باد'' کہا جاتا ہے' اس سے مفہوم درحقیقت ''فساد زندہ باد'' ہوتا ہے۔۔۔ آج فساد اس نے برپا کر دیا' کل کسی اور نے کر دیا۔

قرآنِ کریم کے نزدیک' خارجی دنیا (یا نظام) میں اُس وقت تک کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس

تبدیلی کی متمنی جماعت کے افراد کے قلب و نگاہ میں' قرآنی اقدار کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہو۔ وہ قلب و نگاہ کی اس داخلی تبدیلی کو انقلاب قرار دیتا ہے۔ یعنی انقلاب' قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے مقاصد کے مظاہرہ کا نام ہے نہ کہ محض خارج میں فساد برپا کر دینے کا نام۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا مظاہرہ' انسان کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے۔ اسے وہ ''اعمال صالحہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی قلب و نگاہ کی بنیادی تبدیلی کا نام ایمان ہے اور اس ایمان کے عملی مظاہرہ کا نام اعمالِ صالح۔ اور ان دونوں کے حاملین کا نام ۔۔ جماعتِ مومنین ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جو قرآن کریم کے معاشی نظام (بلکہ ہر قسم کے قرآنی نظام) کی داعی بن کر اٹھتی ہے اور انہی کے ہاتھوں سے یہ انقلاب ہویدا ہوتا ہے۔ قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا کام' ایک دن کی بات نہیں۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب بھی ہوتا ہے اور کافی وقت کا متقاضی بھی۔ اس مرحلہ میں صبر طلبی ہی دشواری نہیں ہوتی۔ اس سے آگے بڑھ کر ایک دشواری اور بھی سامنے آتی ہے۔ وہ دشواری بڑی الجھنیں پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے کہ قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا یہ مرحلہ بڑا غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر نہ کوئی حرکت نظر آتی ہے نہ حرارت اس لئے سطح بین نگاہیں اسے ''بے عملی'' سے تعبیر کر دیتی ہیں اور ان کے اس طعن سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اس جماعت کے زیر تربیت افراد' اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دنیا بہت آگے نکلی جا رہی ہے اور ہم یونہی اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن قرآنی جماعت نہ اغیار کے اس قسم کے طعنوں سے متاثر ہوتی ہے نہ خود اپنے اندر کے افراد سے مصالحت کی خاطر اپنا راستہ بدلنے کے لئے تیار۔۔۔ خود نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ مومنین کی مکی زندگی کی تیرہ سالہ طول وطویل (اور بظاہر بے حس و حرکت) مدت اسی صبر طلبی عشق کی مظہر تھی۔ جب اس جماعت کے افراد میں قلب و نگاہ کی ایسی تبدیلی اور سیرت و کردار میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے اور اس میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں کرتی جسے قرآن فساد قرار دیتا ہو۔

ہم قرآن کے ایک ادنیٰ سے طالب علم ہیں اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہمارا فریضۂ زندگی ہے۔ ہم جہاں قرآن کے تجویز فرمودہ نظامہائے حیات کی تبلیغ کرتے ہیں' اس کے ساتھ ہی اس کے بتائے ہوئے طریقِ کار پر بھی زور دیئے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ہماری دعوت ہے جس پر ہم خود بھی کاربند ہیں اور دوسروں کو بھی اس پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور چونکہ ہمیں قرآن کی اس راہنمائی پر یقین محکم ہے اس لئے ہم کسی خارجی اثر کے ماتحت اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہتے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نماز کی اہمیت

طلوع اسلام کے خلاف مسلسل ہونے والے منفی پروپیگنڈا کے زیر اثر ہمارے نئے قارئین کی طرف سے اکثر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ طلوع اسلام یا پرویز صاحب کا نماز سے متعلق نظریہ کیا تھا؟ سوان احباب کے استفادہ کے لئے نماز سے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی وہ تحریریں جو طلوع اسلام کے مختلف پرانے شماروں اور کتابوں میں شامل ہیں' ان کو یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے آپ اس کاوش کو مفید پائیں گے۔

ایک صاحب نے مجھ سے حسب ذیل سوالات دریافت کئے ہیں۔

(1) آپ کہتے ہیں کہ اسلام قوانین خداوندی کا نام ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت اور مقام کیا ہے؟

(2) نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے۔ آپ نے کہیں اس کی صراحت کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد نماز ہے؟

(3) کیا آپ نماز کی موجودہ شکل کے علاوہ کوئی اور شکل تجویز کرتے ہیں؟

## جواب

(1) اسلام نام ہے زندگی کے ہر شعبے میں احکام خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینے کا۔ ان کی پوری پوری اطاعت کرنے کا۔ نماز' اس طرح سرِتسلیم خم کرنے کا عملی اعتراف اور محسوس مظاہرہ ہے۔ خدا کے سامنے سر جھکا دینے (سجدہ ریز ہو جانے) سے انسان اس امر کا اقرار (یا اظہار) کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر ارادے' فیصلے اور عمل میں اس کے احکام کی اطاعت کرے گا۔ جس کا دل' جذبات فرماں پذیری اور اطاعت گزاری سے لبریز ہو' اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جھک جائے گا اور جو خدا کے حضور سر جھکانے میں عار یا سبکی محسوس کرتا ہے وہ اس کی اطاعت کیا کرے گا؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص زندگی کے مختلف شعبوں میں قوانین خداوندی سے سرکشی برتتا ہے' اس کا نماز میں رسمی طور پر سر جھکا دینا' مقصد صلوٰۃ کو پورا نہیں کر سکتا۔

(2) نماز فارسی (بلکہ پہلوی) زبان کا لفظ ہے جو اہل ایران کے قدیم طریق پرستش کے لئے استعمال ہوتا تھا۔

بعد میں یہ لفظ' اجتماعات صلوٰۃ کے لئے استعمال کرلیا گیا اور اب ہمارے ہاں یہی لفظ مروج ہے (میں سمجھتا ہوں کہ جو اصطلاحات قرآن کریم نے مقرر کی ہیں انہیں اسی طرح استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے) قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔اس کے بنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت ومحکومیت اختیار کرنا ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔لہٰذا جب ہم نماز کا لفظ بولیں گے تو اس کا مطلب صرف نماز ہوگا۔لیکن جب صلوٰۃ کا لفظ استعمال کریں گے تو اس میں نماز بھی آجائے گی اور اس کے علاوہ اور مفہوم بھی۔ میں نے اکثر مقامات پر اس کی صراحت کر دی ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔مثلاً لغات القرآن میں لفظ صلوٰۃ (مادہ ص۔ل۔و(ی) کے تحت آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

صلوٰۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن' زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے وہ فریضہ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت' مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات دی گئی ہیں جن میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لئے آیا ہے۔اس کے بعد لکھا ہے۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔ (نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے)۔

اس کے بعد ارکان صلوٰۃ کی اہمیت کے سلسلے میں لکھا ہے۔

انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اس میں ایسی راسخ ہوچکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔غم وغصہ' خوشی' تعجب' عزم و ارادہ' ہاں اور نہ' وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار' انسان کی طبیعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزت واحترام اور اطاعت وانقیاد کے اظہار کی ہے۔تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔اطاعت کے لئے ''سرِتسلیم خم'' ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے اور محض (Formalism) کو کوئی وزن نہیں دیتا' لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لئے (Form) کی ضرورت ہو' اس سے روکتا

بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس (Form) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہوگا تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے' ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام وعظمت' انقیاد و اطاعت اورفرماں پذیری وخودسپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم وضبط کا ملحوظ رکھنا بجائے خویش بہت بڑی تربیت نفس ہے۔

مفہوم القرآن میں قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں لکھا گیا ہے۔

قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح ''اقامت صلوٰۃ'' ہے جس کے عام معانی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کے ہیں۔ اس لئے صلوٰۃ میں' قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنا بریں اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔نماز کے اجتماعات میں قوانین خداوندی کے اتباع کا تصور' محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ کس مقام پر اقامت صلوٰۃ سے مراد اجتماعات نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کردیئے گئے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ میں نے صلوٰۃ کے معنی نماز اور اقامت صلوٰۃ کے معنی اجتماعات صلوٰۃ کا قیام واضح الفاظ میں دیئے ہیں اور اس سے مراد وہی نماز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔

(3) ایک مقام پر نہیں' متعدد مقامات پر اور ایک مرتبہ نہیں' متعدد بار اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا جاچکا ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں ان میں کسی قسم کے ردوبدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔اسی وجہ سے میں فرقہ اہل قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنہوں نے اپنے لئے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہوجائے اور وہ تمام امت کے لئے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کردے تو یہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑا موثر اقدام ہو گا۔ یہ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد رسالت مآب اور

خلافت راشدہ میں' امت ایک ہی طریق پر نماز ادا کرتی ہو گی۔ اس وقت امت میں وحدت تھی۔ اس لئے جب ہم پھر سے اسی عہد سعادت مہد کی طرف رخ کریں گے تو امت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضرور کرنی ہوگی اور نماز اس کا بہت بڑا ذریعہ ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب امت میں وحدت پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں' تو میں اس سے بحث نہیں کرتا۔

(''طلوع اسلام'' نومبر و دسمبر 1961ء' ص 12)۔

## نماز کی اہمیت

میں نے ایسی باتیں بھی سنی ہیں کہ بعض اراکین بزم یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اب جو اسلام کو سمجھا ہے' اس کی بناء پر نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ''طلوع اسلام'' نے آپ کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز نہ پڑھنے پر فخر کرو؟ آپ نے غیر قرآنی روش زندگی کو تو نہ چھوڑا' اور اس کے بجائے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گئے اور ستم بالائے ستم کہ اپنے آپ کو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستہ ظاہر کر کے ایسی باتیں کرنے لگے۔ طلوع اسلام پر آخر یہ کتنا بڑا الزام ہے جو آپ نے عائد کر دیا۔

ذاتی طور پر مجھ میں بھی کمزوریاں ہیں اور میں ہمیشہ اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ لیکن یہ انتہائی ظلم ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کے لئے جواز کی صورتیں تلاش کرنے لگ جائیں۔ آپ قرآنی نظریات کے خلاف سب کچھ کر رہے ہیں۔ تجارت' کاروبار' شادی' رشتے ناطے سب کچھ ہو رہا ہے۔ بینک بیلنس برابر قائم ہیں۔ قرآن کے مطابق انہیں بدلنے کے لئے آپ کے ذہن میں کبھی کچھ نہیں آیا۔ پھر نماز کے بارے میں ایسا کیوں ہے؟ (بعض گوشوں سے آوازیں آئیں کہ یہ بھی ہمارے مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے جو طلوع اسلام کی تحریک سے وابستگی ظاہر کر کے اس قسم کی باتیں مشہور کرتے رہتے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا) ہم معاشرے میں اصلاح کا آغاز اپنے گھروں سے ہی کر سکتے ہیں لیکن اگر پہلے خود ہی نماز روزہ چھوڑ دیں تو پھر اصلاح کس طرح ہو گی؟ خدارا اپنے قول و عمل کو بصیرت' علم اور خلوص پر مبنی رکھئے۔ ''مقدس بہانے'' تلاش نہ کیجئے بلکہ اعتراف کیجئے اپنی کمزوریوں کا۔ ہم نے قرآنی معاشرہ قائم کرنا ہے جو صرف نیک اور پاکباز زندگی بسر کرنے سے قائم ہو سکے گا۔

(منزل بہ منزل از پرویز' ص 36-35)

## غلط فہمی کا ازالہ

ہماری ہر محفل میں الصلوٰۃ کا بحیثیت نظام جس طرح بار بار ذکر آتا ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا نہ ہونے پائے کہ ہم نماز کے وقت اجتماعات کی اہمیت کے قائل نہیں۔ .....صلوٰۃ کا وقتی اجتماع بھی قرآن ہی کا ارشاد ہے اور یہ الصلوٰۃ کے عالم آرا نظام ہی کی سمٹی ہوئی تصویر ہے۔ جو شخص نماز کی اہمیت کو کم کرتا ہے وہ طلوع اسلام کے خلاف فتنہ و شرارت کا محرک ہے اور ایسی مذموم حرکت کسی طرف سے نہ تو دانستہ ہونی چاہئے اور نہ نادانستہ۔

(ماہنامہ طلوع اسلام' مئی 1959ء ص 14)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

# فنا اور بقا

اَوّل و آخر فنا' باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو' منزلِ آخر فنا

(قسط1)

**فنا۔۔** یہی وہ نقطہ ہے جو اپنی مہیب تاریکی سے قلوب پر دہشت طاری کر دیتا ہے۔ یہیں سے پھر دو واضح طرزِ احساس فروغ پائے۔ ایک کا عنوان Absurdity یعنی لایعنیت متعین ہوا اور دوسرا معنویت سے موسوم ہوا۔ دلچسپ نکتہ اس گفتگو میں بس یہی ہے کہ دونوں انواع کے افکار سے وابستگان بھی بالآخر بظاہر فنا کی وادی میں اتر جاتے ہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (55:26)-

جو مخلوق زمین پر ہے سب کو فنا ہونا ہے۔ (عام ترجمہ)

چونکہ مقصود تنبیہہ کرنا ثقلین کو ہے اور وہ سب اہلِ ارض ہیں۔ اس لئے فنا میں اہلِ ارض کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس تخصیص ذکری سے نفی فنا کی غیر اہلِ ارض سے لازم نہیں آتی۔ (عام تفسیر)

Everyone who is upon it, i.e., on earth and/or, according to Ibn Kathir, in the heavens--since the Pronoun in 'alayha apparently relates to the whole Universe. (Allama Muhammad Asad).

ویسے (وحی سے بے نیاز) حضرتِ انسان کا المیہ بھی عجیب تر ہے کہ جب سے روئے ارض پر اس کی تشکیل ہوئی ہے' اس کے پاس بجز Interpretation کے کچھ نہیں ہے۔ وہ تاویل در تاویل! توضیح' تشریح' Analogy اور Induction وغیرہ کے معتبر گورکھ دھندوں میں صدیوں سے الجھا ہوا ہے۔ اور اب تو اسے اس سے وابستہ جھنجلاہٹ کی عادت (Addiction) سی ہوگئی ہے۔

بہر رنگ اسے اپنے اور گردوپیش کے فانی ہونے پر یقین ہے اور بے چارہ اس سچائی سے انکار بھی کیسے کر سکتا ہے؟ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ یہ کہہ کر اس فانی

جہان اور اپنی ناپائیدار ہستی کو تسلی دے لیتا:۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

اس باب میں انسان کا مہوس ہونا اپنی جگہ لیکن اس کے ساتھ ساتھ فنا کی تلخ حقیقت نے اس کے اندر ایک اور ردِعمل بھی پیدا کیا کہ اس نے خود کو اور موجودات کو فانی تسلیم کرتے ہوئے' ان کی نفی کا رویہ اپنا لیا۔ یوں اس نے زیست کے دورانیے کو فریب سے تعبیر کیا۔ اسے مایا کہا' وہم قرار دیا' نِرا پُرا التباس یقین کیا۔ اس Fantasy نے اس سے ایسے پرکشش شعری پیکر بھی ترشوائے:۔

لگتا ہے کہ سچ مچ کہیں موجود ہے دنیا
ہم وہم بھی کرتے ہیں تو کرتے ہیں یقیں سے

☆☆☆

اِک تصور پس دیوارِ بنا رکھا ہے
ورنہ دیوار کے اس پار بھی کیا رکھا ہے

☆☆☆

میں لہلہاتی شاخ کو سمجھا تھا زندگی
پتا گرا تو درسِ فنا دے گیا مجھے

☆☆☆

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

☆☆☆

بحر میں کچھ نہیں قطروں کے سوا کیا سمجھے
ہوئے جاتے ہیں یہ قطرے بھی ہوا کیا سمجھے

☆☆☆

موجود ہم جو ہیں بھی' تو اپنے گمان میں

☆☆☆

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

☆☆☆

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

☆☆☆

وغیرہ وغیرہ!

قصہ مختصر فنا سے بے پناہ ہراساں فرد نے اِک عالمِ وحشت میں زندگی کے زندان سے فرار ہونے میں عافیت سمجھی' مگر جس جنگل میں جا کر اس نے قندیلِ رُہبانی روشن کی' اِتفاق سے وہ بھی حیات کے مدار میں ہی شامل تھی۔ ایسے بھی ہیں جو تیاگی بن کر جیتے جی قبرستانوں میں جا آباد ہوئے۔ اپنے کسی پیارے کی مرقد کے مجاور ہو کر انہوں نے خود کو (اعلانیہ) شاکی ڈکلیئر کر دیا کہ میں اپنی اس عزیز چیز کو زندہ تو نہیں کر سکا لیکن جس نے مجھ سے یہ پیارا وجود چھینا ہے' میں اس کی تخلیق کردہ نام نہاد زندگی کو آوازِ بلند مسترد کرتا ہوں اور یہ مزاحمت کار ایک قدم اور بھی آگے بڑھے کہ پاس ہی ایک گڑھا کھود کر' اسے گھروندا بنا لیا اور

حیاتِ مستعار کی باقی ماندہ سانسیں وہاں سو جاگ کر بِتا دیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جب سینے میں سانس کی دستک تھم جائے گی تو اردگرد بسنے والے چند مقامی رسومات کو آفاقی فرائض گردانتے ہوئے بااہتمام یہیں لا کر پھر دفن کر دیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ یہ کام کافی حد تک جیتے جی خود ہی کر لیا جائے؟ بہرطور یہ لوگ ذرا کم ہمت ہوتے ہیں۔ ایک طبقہ بہادروں کا بھی ہے جو اس سے بھی آگے گئے کہ فنا کا ادراک ہوتے ہی انہوں نے ایک زہریلا قہقہہ فضا میں بکھیرا اور آناً فاناً اپنی گردن میں رسی کس کر چھت میں نصب ہک سے یہ کہتے ہوئے جھول گئے کہ اب جلاؤ یا دفناؤ' اس سے کیا فرق پڑتا ہے! ؎

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

صاحبو! کسی کو راہب یا تارک الدنیا ہونے کا طعنہ دینا بظاہر بہت آسان ہے۔ مانا کہ اوپر ہم نے بھی کافی طنزیہ انداز اختیار کیا ہے کہ دشت وصحرا اور گورستان اسی دنیا میں واقع ہوتے ہیں۔ یعنی جو علائق سے بے گانہ ہو کر' جی ہاں! سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان مقامات میں جا بیٹھتا ہے' وہ رہتا بہرحال اسی جہان میں ہے۔ چلئے نہایت محدود پیمانے پر ہی سہی دنیا کی چیزوں اور چند مقتضیات کا بہرحیث محتاج رہتا ہے۔ اور ان چند اسباب کو مہیا کرنے کے لئے تھوڑی بہت تگ وتاز بھی کرتا ہے۔ لیکن عملی رہبانیت چاہے کسی بھی سطح کی ہو ایسا پرسہولت کام بھی نہیں ہے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے محبوب وجود کی تدفین کے بعد اترنے والی پہلی رات ہی اس کے سرہانے بیٹھ کر گزارتے ہیں؟ اس فنا ہو جانے والے کو تنہا ہی سپردِ خاک یا نذرِ آتش ہونا پڑتا ہے۔ اور ہم ''فائنل ٹچ'' کے ساتھ ہی اپنی جگمگاتی حیاتی میں اس طرح لوٹ آتے ہیں کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔ بڑے ہی بے رحم' سنگ دل اور کٹھور ہیں ہم!

ہاں ہمیں اپنے اس طرزِ عمل پر Guilt کا احساس ہوتا ہے۔ جس کا حل یہ تلاش کیا ہے کہ فنا کو بقا سے معنون کر دیا اور رفتہ رفتہ اس پر پکے ہو گئے۔ ظاہر ہے ہمیں فنا کی اس مسلسل لٹکنے والی تلوار کو کسی طرح نظروں سے اوجھل بھی تو کرنا تھا تاکہ اس چار روزہ زندگی سے محظوظ ہو سکیں' اس کی لذتوں سے فیض یاب ہو سکیں' ہم مقدور بھر کوشش کرتے ہیں کہ رنگ میں بھنگ نہ پڑے۔ ہم نے بڑی دشواری کے ساتھ خود کو سمجھایا ہے کہ کبوتر کے آنکھیں میچ لینے سے بلی سچ مچ غائب ہو جاتی ہے اور جب بلی اپنی مرضی سے ہمیں تھوڑی Relaxation دے دیتی ہے تو ہمارا یقین اور پختہ ہو جاتا ہے کہ وہ موصوفہ ٹل گئی ہے۔

اور اس مہلت پر مشتمل عرصے کے دوران میں ہم لذائذ دنیوی سے خوب متمتع ہوتے ہیں۔ اور جب ہم کسی لذیذ شغل میں پوری طرح مشغول ہوتے ہیں تو فنا کی بلی اپنے نوکیلے پنجوں سے ہم پر اچانک حملہ آور ہو جاتی ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا باقی وجود فانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بڑے چاؤ اور انہماک سے جو دنیا ہم نے اپنے اردگرد جمع کی ہوتی ہے' وہ ایک ہی جھٹکے میں ہم سے چھن جاتی ہے۔ ہم نے کس قدر محنت سے تعلیم حاصل کی ہوتی ہے تاکہ وہ ڈگری ہمارے نام کو قابل رشک وقار عطا کرے مگر ہم اس شاندار کلغی سمیت منوں مٹی تلے دب جاتے ہیں۔ ایک ان پڑھ اور پڑھا لکھا شخص فنا کے بعد کیا یکساں نہیں ہو جاتے؟ عالی شان محلات میں رہنے والا اور ایک مرلے کے کھنڈ لے میں رہائش پذیر واقعۂ ارتحال کے بعد کیا برابر نہیں ہو جاتے؟ ایک بادشاہ اور فقیر زیرِ زمین پہنچ کر کیا مساوی نہیں ہو جاتے؟

دوستو! آپ پریشان کیوں ہو گئے ہیں؟ یہی سوال آپ کے ذہنوں میں کلبلا رہا ہے نا کہ پھر ہم کیا کریں؟ کیا سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیں؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں! ایسا مت سوچیئے! ویسے آپس کی بات ہے کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ ارے نہیں جناب! ایسا کرنا ایسا سہل بھی نہیں ہے۔ وہ جو لایعنیت کے فلسفے کے پیشہ ور پرچارک ہیں' وہ بھی آٹھ آٹھ کنال کے فرنیشڈ گھروں میں رہتے ہیں اور وہ گھر چوہڑ کانے یا کھڑیانوالہ میں نہیں' بڑے شہروں کے Posh علاقوں میں اُگے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی ڈیفنس میں جا کر جنت نظیر مکانات کی زیارت کیجئے گا۔

ہاں رہے وہ روایتی خوش فہم جنہیں غیاب پر پورا اعتبار ہے کہ سب باقی ہے' وہ تو کچھ زیادہ ہی لمبے پروگراموں اور وسیع منصوبوں کے خالق ہیں۔ ان کے مطالبات کا جہان بے حساب پھیلا ہوا ہے۔ ''نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے''! واقعتاً ان کے تقاضوں کی سرحدیں ابھی دریافت نہیں ہو سکیں۔ اسی لئے تو وہ نظریۂ فنا پر عملی یقین رکھنے والوں کو کاہل' مایوس' قنوطی' بے عمل' غافل' نکمے' ہڈحرام' زندگی کی ارضی حقیقتوں سے مفرور قرار دے کر دن رات کوستے رہتے ہیں۔ لیکن یہ ''عملیت پسند'' اعمال کا جو پیکج مہیا کرتے ہیں' اس میں ترکِ دنیا سرِ فہرست ہے۔ کہتے ہیں دنیا چھوڑ دو' یہ یہ وظیفے کرو' اگلے جہان میں بڑی زبردست دنیا ملے گی۔ اس طرح سرمایہ داروں کو ''واک اوور'' دینے کی ذمہ داری ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔

یہ دنیا ہے بڑی دلچسپ جگہ' نہایت متنوع مقام' بوقلمونیوں کا شمار نہیں۔ اوراد و وظائف سے غفلت برتنے والوں کو بھی نہیں چھوڑا جاتا کہ گمان کیا جاتا ہے یہ گروہ نعمائے اخروی کا منکر ہے اور ایسے ''انکاری'' مروج مبلغین کے جلیل مقاصد کی راہ میں بالیقین رکاوٹ بنتے ہیں۔ ظاہر ہے جب طالب کو اگلا گھر سبز باغوں میں گھرا ہوا دکھایا جائے گا' تبھی وہ اپنی موجودہ پراپرٹی سے دستبردار ہو گا۔ اب کیا عرض کریں کہ ''قبضہ گروپ'' کی وارداتیں کتنی باریک ہیں! دیکھئے اس موضوع پر قاضی حبیب الرحمٰن صاحب نے کتنا خوبصورت اور لطیف شعر کہا ہے: ؎

بس کہ اور اس کے سوا کچھ نہیں دیں سے مقصود
صرف دنیا طلبی اور ہمیشہ کے لئے

دوسرا گروہ وہ ہے جو رسمی پرچارک ٹائپ افراد پر تو مشتمل نہیں ہے' مگر اس Setup کو ''بوجوہ'' برقرار رکھنا اس کی بنیادی ضرورت ہے۔ آپ کا بھی عمومی مشاہدہ ہوگا کہ یہاں کم وبیش ہر شخص دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کے درپے ہے اور اس حد تک کہ جو آگے نکلتا ہوا محسوس ہو' اس کی ٹانگ کھینچنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ساری جائیداد پر اکیلا قابض ہونے کے خواب میں شریک کو غائب کر دینے کی باقاعدہ پلاننگ کرتا ہے۔ لیکن اگر بالفرض کوئی اپنے آپ اس ناپائیدار دنیا سے دستکش ہونے کا عندیہ ظاہر کر دے تو معاشرے کا معتد بہ حصہ اس کے خلاف آناً فاناً متحدہ محاذ بنا ڈالتا ہے کہ تمہیں جرأت کیسے ہوئی اس عظیم دنیا کو ٹھکرانے کی؟

کیا عجب اس کارروائی کا ایک سبب یہ ہو کہ اسے اپنی فتح کی Recognition کے لئے شکست خوردہ کا حاضر ہونا ناگزیر محسوس ہوتا ہو۔

آپ نے دیکھا ہوگا وہ جو کسی وجہ سے ازدواجی زندگی کو ایفورڈ نہ کر سکتا ہو اور اس لئے وہ مجرد زندگی کو ترجیح دے بیٹھے۔ طعنے مار مار کر اسے ادھ موا کر دیا جاتا ہے۔ وہ جو معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جائے' کو سنے دے دے کر اس کا جینا دوبھر کر دیا جاتا ہے۔ یہاں تو شاید ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے سوا Option ہی نہیں ہے۔ آپ فنا کی صداقت کو قبول کر کے دس فیصد ہی Incentives کو منہا کر کے دیکھئے' کس طرح پوری سوسائٹی پنجے جھاڑ کر آپ کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ہمیں یہ خبر البتہ نہیں ہے کہ پیچھے رہ جانے والے شخص کو مطعون اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ وہ آگے بڑھے یا اپنے ذوقِ طعن' تذلیل وتضحیک کے سفلی جذبے' احساسِ برتری سے محظوظ ہونے اور اسے نکو چھوٹا ثابت کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے؟ تاہم ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ فنا کے دھرم کو ماننے اور منوانے کے لئے خواہشوں کے جال بڑی ہی کلاکاری سے بنے گئے ہیں' جو کسی ایک لمحہ کے لئے بھی گمراہ ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ویسے کبھی تنہائی میں غور کیجئے گا کہ آرزوؤں کی پرستش میں کتنا حصہ فطرت کی Exploitation کا ہے؟ اور کتنا حصہ معاشرے کا ہے؟ ہماری دانست میں نوے فیصد تمناؤں کا نظام سماج کی دین ہے۔ جو کسی ایک بھی امنگ سے کنارا گیر ہونے کا تاثر دیتا ہے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی جاتی ہے۔ عین ممکن ہے چڑی اتارنے کے پیچھے اپنی بڑائی اور قساوت ہی کارفرما ہو۔ بہرنگ ان پیچیدہ تناظرات میں دنیا ایسا شوروم ثابت ہوتی ہے جہاں بلاضرورت خریداری پر ہر مشتری پابند ہے۔ اس لئے کہ اس سے اس شوروم میں قدم دھرنے کا ناقابل معافی گناہ جو سرزد ہو چکا ہے۔ طرہ یہ کہ گاہک سادہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے شاپنگ کر

رہا ہوں۔ واہ سوداگرو! تمہاری کاروباری ذہانتیں! جیسے بنکوں سے قرضہ لینے والا ہر مقروض یہ یقین رکھتا ہے کہ بنک نے قرض دے کر مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ یاد رکھئے پچانوے فیصد قرضے' قرض خواہ کی عیاری کی وجہ سے لئے جاتے ہیں۔ قرض دینا' قرض لینے کی نسبت کہیں بڑی ''مجبوری'' ہے۔ مگر افسوس! کہ ہر مقروض آخری حد تک یہ ایمان رکھتا ہے کہ مجبور وہ ہے' قرض خواہ نہیں۔ یہاں شکار شکاری کا شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتا۔ یاللعجب!

سو بھائی! جینا ایک جبر ہے۔ یہاں آپ ترکِ دنیا نہیں کر سکتے۔ آپ کو دھکے دے دے کر' مسلسل Push کرکر کے پیش قدمی پر مجبور کیا جائے گا۔ کبھی اولاد کے لئے ترکہ چھوڑنے کی الہامی تاکید کی جائے گی۔ کبھی دھتکارے جانے کا خوف دلا کر آپ کو خوشحال ہونے کی ترغیب دلائی جائے گی۔ کبھی احساس کمتری کے عارضی سے بچاؤ کے لئے آپ کو بہتر ہونے پر آمادہ کیا جائے گا۔ ہم یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتے:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دِل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اس لئے کہ جہانِ فردا بے شک سچ ہے' جنت بلا شبہ برحق ہے لیکن کبھی اپنے سبز باغوں سے مزین خانہ ساز سُورگ کے تحفظ کی خاطر آپ کی تائید حاصل کی جائے گی۔ ظاہر ہے مذکورہ نظری اور عملی تائید اس لئے ناگزیر ہے کہ جب آپ باقی ہونے کی نفی کریں گے اور فانی ہونے پر مصر ہوں گے تو وہ سارا Set Up جو رائج الوقت تصور بقاء کے ساتھ جوڑ کر بڑی محنت سے تعمیر کیا گیا ہے' وہ خطرے میں پڑ جائے گا اور متوقع خسارے سے مامون رہنے کے لئے آپ کو زندہ رکھا جائے گا' زندہ رہنے پر مجبور کیا جائے گا۔ لیکن جب آپ زندہ نہیں رہیں گے تو مٹی میں دفن کرتے ہی آپ کو بھلا بھی دیا جائے گا۔

بس ہم ایسے ہی ہیں' مرنے والے کو چند رسومات کے حصار میں لے کر وقتی اعزاز سے نواز دیتے ہیں مگر زندہ کے لئے ہمارے پاس توقیر کا کوئی پروگرام نہیں ہے:

یہ جو اب کھود رہے ہیں زمین میرے لئے
میں جی اٹھوں تو کہیں بھی جگہ نہیں دیں گے

اس Paradoxy پر سقف شگاف قہقہہ بلند کرنے سے پہلے ذرا ٹھہریئے اور نفسِ مضمون کے تناظر میں اس پہلو پر ضرور غور کیجئے کہ فنا صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو پہلے موجود ہو۔ فنا کے ساتھ وابستہ شدید حساسیت کی وجہ سے ہم افراط و تفریط کا شکار ہو گئے ہیں کہ جب ہم نے دیکھا آخرِ کار ہمارا جسم فنا ہو جاتا ہے تو ہم ایک دم بددِل ہو گئے' جب ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ چیزیں مآل کار معدوم ہو جاتی ہیں' ہمیں اس عارضیت نے شاکی بنا دیا کہ جاؤ! ہم نہیں لیتے:

نے گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوسِ رنگ و بو کریں

حضرت علیؓ کے الفاظ میں:

ہوتمہارے یہاں کی خبر
اے وحشت زدہ گھروں
اُجڑے مکانوں
اوراندھیری قبروں کے رہنے والو
میرا اسلام قبول کرو
اے بے کسی کے مارو
اے خاک نشینو! تنہائی کے قیدیو
تم تیز قدم تھے، ہم سے آگے نکل گئے
لیکن ہم بھی بس آیا ہی چاہتے ہیں
تمہارے قدم ہمارے لیے نشانِ راہ ہیں
اور ہاں سنو!
تم نے جو گھر بنائے تھے ان میں کوئی اور بس رہا ہے
تم نے جو بیویاں چھوڑی تھیں
غیروں نے ان سے نکاح کر لئے
اور مال جس کے لئے تم ہلکان ہوئے
جان جوکھوں میں ڈالی
دوسروں نے کھا پی لیا ہے
یہ تو تھی ہمارے ہاں کی خبر
اب کچھ اپنی بھی سناؤ؟
کہو تمہارے یہاں کی کیا خبر ہے؟

سیدنا علیؓ کا یہ خطاب اہلِ قبور سے مشہور ہے۔ روایت ہے جب آپ صفین کے محاذ سے دارالخلافہ واپس تشریف لا رہے تھے تو راستے میں ایک خستہ حال قبرستان آیا، جھکے ہوئے کتبوں، دھنسی ہوئی زمین، بکھرے ہوئے انسانی اعضا کو دیکھ کر آپ نے کہا: کہو تمہارے یہاں کی کیا خبر ہے؟ وہ ہڈیاں کیا جواب دیتیں اور یہ ہڈیاں جن پر گوشت چڑھا ہوا ہے کیا جواب دیں گی؟ امرِ واقعہ سے کون بے خبر ہے! سب باخبر ہیں بس فرق یہ ہے کوئی ظاہر کر دیتا ہے، کوئی مصلحت سے کام لے لیتا ہے۔

ہاں دوستو! یہ سچ ہے کہ اگر فنا نہ ہوتی تو دنیا میں کوئی دھرم نہ ہوتا، کم از کم روایتی دھرم نہ ہوتے۔ زندگی گزارنے کے لئے ضوابط کا جہان بالکل مختلف ہوتا۔ یہ فنا ہے جو موجودات کے تعینات کے اعتبارات سے تھوڑے تھوڑے امتیاز کے ساتھ فیصلہ کن کردار ادا کر رہی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو واقعات کو ہم اتنی ہی وقعت دیا کریں جس کے وہ حقیقی طور پر مستحق ہیں! ہم فنا پر رنجیدہ ہوئے تو دل گرفتہ ہو کر دنیا کی یکسر نفی پر اتر آئے۔ یا پھر اسی Reaction میں دوسری انتہا کی اور نکل گئے۔ اور کسی فلسفیانہ ابدی بقا کے چکر میں پڑ گئے۔ حیف! ہمارا مسئلہ موجودہ بدن (بلکہ بدنیات) سے اوپر نہ اُٹھ سکا۔ ہم Form کے پجاری ہیں۔ ادھر قصہ یہ ہے: ؎

اس نے پیکر میں نہ ڈھلنے کی قسم کھائی ہے
اور مجھے شوقِ ملاقات لیے پھرتا ہے

نیز ؎

وہاں بیت الحرم خالی' یہاں بیت الصنم خالی
پتہ ملتا نہیں اس کا عرب خالی عجم خالی

اس پریشانی کا حل ہم نے یہ ڈھونڈا کہ اپنی تسلی کے لئے خدا کو پتھر کے صنم میں Reduce کرلیا۔ اور جو ذرا اوپر اٹھے بھی وہ پیہم تڑپ رہے ہیں کہ ہزاروں سجدے جبینِ نیاز میں بے چین ہیں ۔ پلیز! لباسِ مجاز میں ذرا سامنے آؤ۔ شخصی خدا کے تصور سے یہی مسائل ''ازلوں'' سے وابستہ ہیں۔ افسوس! ہم نے خود کو بھی خدا پر قیاس' کرلیا اور یوں اس بدن سے جدا ہونے کے بعد ہماری آرزو یہی رہی کہ دوبارہ عین مین اسی سریر میں ہم نمودار ہوں ۔ ہمارا سارا سفر سے جسم سے اسی جسم تک کا سفر ہے اور اسی کو ہم بقا سمجھنے کے گمان میں مبتلا ہیں ۔

اب جانے بھی دیجئے اس ''بدن کہانی'' کو۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ یہ بدن ملنے سے پہلے بہرحال ہم یہ بدن نہیں تھے بلکہ ''شے مذکور'' ہی نہیں تھے۔ اگر ہماری ذات نے چار دن کے لئے اس بدن کی خانقاہ میں پڑاؤ کر ہی لیا ہے تو اب اس پر اس قدر رکے ہونے کی کیا ضرورت ہے کہ دوبارہ بالکل اسی تن میں' اسی قالب میں' اسی بت میں ڈھلیں ۔ حقیقت میں ہمیں اپنی جان' جان سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ ہم اسی کے توسط سے ازسرِنو اپنے اسی بدن میں منتقل ہونے اور پھر اسی بدن کو زندہ کرنے اور دیکھنے کے شدید متمنی ہیں اور اس سے جڑے جملہ لوازم کو باقی دیکھنے کی للک میں ہم نے Eternity کو Fantasy بنا لیا بلکہ Fantasy کو Eternity بنالیا۔

اس صورت حال کے حوالے سے قرآنِ مجید کے صرف ایک مقام کو ہم Quote کرنا چاہیں گے:۔

جب ابراہیمؑ نے کہا' اے پروردگار! مجھے دکھلا دے کہ تو کس طرح مُردوں کو زندہ کر دے گا؟ ارشاد ہوا' کیا تیرا اس پر ایمان نہیں کہ اس پیغام سے مُردوں کو زندگی مل سکتی ہے؟ عرض کیا کہ ایمان کیوں نہیں' لیکن سوال سے مقصود اطمینانِ قلب ہے۔ ارشادِ الٰہی ہوا' اچھا یوں کرو کہ جنگل میں سے چار پرندے پکڑ لو اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو اپنے سے دور ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو' پھر انہیں بلاؤ وہ آواز سنتے ہی تمہاری طرف اُڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔(2:260-262)

اس آیت میں داعی کو دعوت کی Wisdom بطور مثال محسوس سطح پر سکھائی سمجھائی گئی ہے لیکن جب اس پر روایتی تفسیری حواشی نے یلغار کی تو پرندوں کا قیمہ بنوایا گیا' پھر اسے Mix کیا گیا' ازاں بعد ''قیمہ'' کو دُور پہاڑوں پر رکھوایا گیا' آواز دلوائی گئی اور وہ طیور زندہ ہوکر اپنے انہی

ابدان (اصلی اجسام) کے ساتھ اڑتے/ دوڑتے ہوئے آ گئے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ ''دوبارہ زندگی'' کے متعلق شکوک وظنون تو ان قلوب میں مسلسل پرورش پا سکتے ہیں جن کا کل انحصار 'ایمان بالغیب' پر ہوتا ہے' جنہوں نے خدا کے ہونے پر کوئی مشاہدہ نہیں کیا ہوتا۔ انہیں تو ایسا کوئی کرشمہ نہ دکھایا گیا اور وہ عظیم نبی جو شب و روز مکالمہ ومخاطبہ کے شرف سے مشرف کیا جا رہا ہے' وہ ایمان کے باوصف طمانیتِ قلب کے لئے مطالبہ کر رہا ہے کہ مردے زندہ کر کے دکھا دیجئے۔ درآں حالیکہ ایمان کو اطمینان سے تقویت پہنچانے کے واسطے ضروری تھا کہ یہ نظارہ غیر نبیوں کو دکھایا جاتا تاکہ ان کے دلوں میں پھنسی ہوئی پھانس نکل جاتی' مگر جناب ابراہیمؑ کو بھی کیا دکھایا گیا کہ قیمہ پہاڑوں پر رکھوا دیا گیا' پھر پرندے بھیجے گئے۔ آخر وہیں قیمے کو پرندوں میں کیوں نہ تبدیل کر دیا گیا؟ کیا اس Doubt کا Benefit کسی کو پہنچانا مطلوب تھا کہ یہ ''وہی'' پرندے تھے یا دوسرے؟

مزید دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ابھی ابھی اپنے عہد کے حکمران سے ''مناظرہ'' کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ جس میں وہ اپنے خدا کے ہونے کی مسکت برہان یہ پیش کر رہے ہیں کہ میرے پروردگار تو وہ ہیں جو زندہ بھی کرتے ہیں اور مارتے بھی ہیں۔ کیا یہ محض دلیل برائے دلیل ہی تھی؟ حضرت ابراہیمؑ خود عالم تذبذب میں ہی تھے؟ ویسے اللہ تعالیٰ معاف فرمائے' جس طرح حاکم نے جواباً یہ کہا کہ محترم! یہ کام تو میں بھی کر لیتا ہوں اور اس موضوع پر حضرت ابراہیمؑ نے مزید گفتگو نہ کر کے دوسری دلیل کی طرف بحث کو موڑ دیا' اکل کھرے یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ لاجواب ہو گئے۔ ان کے اپنے دل میں یہی تشکیک موجود تھی' جانے خدا مرے ہوؤں کو کیسے اٹھائے گا؟ اور پھر اپنی تشفی کے لئے انہوں نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔ سوانہیں چاہئے تو یہ تھا کہ اسی وقت اللہ تعالیٰ سے رابطہ کرتے' وہیں بادشاہ کے سامنے پرندوں کا قیمہ کیا جاتا' پھر بادشاہ سے کہا جاتا' اگر آپ زندگی موت پر قدرت کے مدعی ہیں تو دکھایئے اپنی خدائی! اور جب بادشاہ ایسا نہ کر سکتا تو ابراہیمؑ کا خدا عین موقع پر ان پرندوں کو زندہ کر دیتا۔ اس طرح ملحد شاہِ عراق پر اتمامِ حجت بھی ہو جاتی اور حضرت ابراہیمؑ کے قلب کو اطمینان بھی نصیب ہو جاتا۔

لیکن دوستو! ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ ہوا ہے تو یہ کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی دلیل سے دستبردار ہو گئے ہیں اور بعد میں اکیلے میں اللہ سے پوچھتے ہیں کہ مرے ہوئے زندہ کیسے ہوں گے؟ اور اللہ بھی جب مشاہدہ کراتے ہیں تو اس طرح کہ شک بدستور موجود رہتا ہے (یا منطقی طور پر رہ سکتا ہے) کہ سامنے یہ وقوعہ نہیں ہوتا' Mystery پھر برقرار رہتی ہے۔ چمتکار آنکھوں سے دور ہی ہوتا ہے۔

قارئین! آیت کی تفسیر کرنا ہمارا منصب نہیں ہے لیکن قرآن کے طالب علم ہونے کی حیثیت سے اس آیت کی روشنی میں اصل Thesis پیش کرنا چاہتے ہیں کہ جسمانی سطح پر دوبارہ زندگی کا کرشمہ دکھانا' خدا کا مقصود ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی اسے سریت (Mystery) کہنے پر مصر ہے تو بھلے مصر رہے۔ ہمیں اس پر چنداں اعتراض نہیں ہے۔ بہرحال ہم اتنا جانتے ہیں یہ سرِّ عقل وشعور کی موجودہ سطح پر شاید اس حیات میں Unfold نہیں ہوگا۔

اسی لئے تو جناب ابراہیم علیہ السلام نے الحاد زدہ اس نادان حکمران کی نامعقول دلیل پر مزید استدلال قائم نہیں کیا۔ وگرنہ اس بے وقوف کا منہ بند کرنے کے لئے یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ چلئے آپ اپنی آمریت کے زعم میں کسی کو موت کے گھاٹ تو اتار سکتے ہیں یا عین اس وقت جب اسے گیلوٹین کیا جانے لگے تو اس حکم کو کالعدم قرار دے کر زندگی بخش سکتے ہیں۔ لیکن یہ آپ کے بس میں بھی نہیں ہوگا کہ ایک بار وہ سچ مچ مرجائے تو اسے سچ مچ دوبارہ زندہ کر دیں۔

اور اسی کو Vice-Versa دیکھیں تو وہ حاکم بھی اپنے مدمقابل پیغمبر سے یہی مطالبہ کرسکتا تھا کہ پڑوس میں موجود قبرستان سے کسی مردے کو اٹھا دیجئے' اور حضرت ابراہیمؑ اللہ کے پیارے نبی تھے' قانونِ خداوندی کی محکمیت کا ان سے بڑھ کر کس کو ادراک ہوسکتا تھا۔ سو انہوں نے بادشاہ کی کٹ حجتی اور کج بحثی کی خو کو بھانپتے ہوئے اس خصوصی تناظر میں دلیل بازی کے عمل کو آگے نہیں بڑھایا۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے یوں مردوں کو زندہ کرنا خدا کے پروگرام کا حصہ ہی نہیں ہے۔ اگر اسی طرح لوگوں سے خدا کی خدائی منوائی جانی مقصود ہوتی تو بھلا اس عظیم خالق و مالک کے لئے یہ کوئی مشکل کام ہے؟ لیکن اس کا اٹل ضابطہ ہے کہ جو ایک بار مرجائے گا' وہ حیات کے اس عرصے میں دوبارہ قطعاً اس جسم کے ساتھ زندہ نہیں کیا جائے گا۔

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آجاتی ہے تو کہتا ہے: اے میرے رب! مجھے لوٹا دیجئے۔ شاید کہ میں اچھے کام کروں اس (دنیا) میں جسے چھوڑ آیا ہوں۔ ہرگز نہیں! یہ تو محض ایک بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے۔ اور ان کے پیچھے ایک روک حائل رہے گی اس دن تک کہ وہ اٹھائے جائیں گے۔'' (23:100-101)

واقعہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اور بادشاہ کے مابین خدا کی اس صفت' قدرت یا بدنی سطح پر احیائے موتی کی گفتگو ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں تو اللہ کی حاکمیت موضوع تھی۔

حقیقتاً حضرت ابراہیمؑ کا موقف یہ تھا کہ:

''میں جس نظامِ خداوندی کے قیام کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کی ایک اہم خصوصیت انسانی جان کا احترام ہوگا۔ اس میں موت اور حیات کے فیصلے

خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے۔ کسی فرد (آمر) کی مرضی کے مطابق نہیں ہوں گے۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے (دراصل یہ) کہا کہ میں کسی ایسے نظام کو نہیں جانتا۔ میری مملکت میں میرا حکم ہی نظام اور قانون ہے۔'' (مطالب الفرقان' جلد سوم' ص 456)۔

ایک نبی سے منسوب انقلاب آفریں پیغام یہی ہوسکتا ہے۔ جادوگری کا مقابلہ نہیں۔ صد حیف! کہ ہمارے ہاں حق و باطل کا معیار' صدق و کذب کا پیمانہ ساحری اور چمتکار رہ گیا ہے۔ آپ خود سوچئے کہ اگر اس معیار پر ہمارے سچے خدا نے فتح حاصل کرنی ہوتی تو اس کے لئے کیا دشوار تھا؟ وہ ایک آن میں اپنے حریف کو بندے سے بکری بنا کر بھرے دربار میں اس کی ''مَیں مَیں'' کروا کے اپنے لئے تالیاں نہیں بجوا سکتا؟ حضرت موسیٰؑ اپنے رب سے کہہ کر فرعون کو ایک ساعت میں مرغا بنوا دیتے۔ لیکن ایسا تمسخر خاکم بدہن الوہی پروگرام کا حصہ نہیں ہوسکتا۔

اب رہا حضرت ابراہیمؑ کا طیور کے حوالے سے احقاقِ حق کا ایشو' تو انہوں نے بہ تقاضائے بشری اپنے اوپر اترنے والی عظیم ذمہ داری پر اضطراب کا بالکل فطری اظہار کیا ہے۔ جہاں ایسے جاہل آمر مسلط ہوں' جہاں جمہور' سچ کو چٹکیوں میں اڑانے کے خوگر ہوں' جہاں سنجیدہ مکالمے کی فضا نہ ہو' جہاں براہین کے سامنے جگتیں اور پھبتیاں ہوں' جہاں معروضی حقائق کو جاننے اور جانچنے کی صلاحیت نہ ہو' جہاں مفادات کی شبانہ روز پرستش ہوتی ہو' جہاں احبار و رہبان کے رسوخ کے روبرو عوام دم بخود ہوں' جہاں نجی ملکیت کو لیلیٰ کا درجہ حاصل ہو' جہاں طاقت کا راج ہو' جہاں فرعون' ہامان اور قارون کی تثلیث متحد ہو کر عامۃ الناس کا استحصال کرتی ہو' جہاں خوئے غلامی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکی ہو' جہاں جہالت کا دور دورہ ہو' جہاں مذہبی پیشواؤں کے طاغوتی اشارے پر ان پڑھ لونڈے لپاڑیے صادق کا مذاق اڑاتے ہوں' جہاں نسل نو میں روحِ طائفیت تر از و ہو چکی ہو' جہاں چندہ اکٹھا کر کے حق پرستوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہوں' جہاں لاؤڈ سپیکر کو سب سے بڑے ہتھیار کا مرتبہ حاصل ہو' جہاں اجلاف و اشراف عقل و فہم کے پیدائشی بیری ہوں۔۔۔ ہاں سوسائٹی میں ایک بھی کل سیدھی نہ ہو وہاں خدا کے امین کا اضطرار بالکل بجا ہے کہ میں اِن ''مُردوں'' کو راستی کی تعلیم کیسے دے سکوں گا؟ پتھر پر جونک کتنی موثر ثابت ہو سکے گی؟

اس پرخلوص بے تابی پر نہایت خوبصورت ہدایت نازل ہوئی' گھبرائیے نہیں میرے صاحب! ان سے اُنس پیدا کیجئے' محبت سے انہیں اپنے قریب لائیے۔ ''جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے''۔ اگر یہ لوگ اس قدر بگڑے ہوئے نہ ہوتے' ان میں سنوار ہوتا تو آپ کو بطور مامور ہمیں زحمت دینے کی ضرورت ہی کیا تھی! جناب! ہمت سے کام لیجئے' آگے بڑھیئے' جو روشنی آپ کو دی جا رہی ہے' اس میں

اتنی توانائی متحرک ہے کہ اگر آپ احسن اور حکیمانہ انداز میں بات ان تک پہنچا دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ بھٹکے ہوئے افراد راست جادوں پر گامزن نہ ہوں۔ یہ صدیوں سے مرے ہوئے' ساعتوں میں زندہ ہو سکتے ہیں' بس پہلے مرحلے میں ان سے سچا' بے ریا' خالص' عمدہ' مناسب' پیار بھرانا تا استوار کیجئے' پھر دیکھئے سدھائے ہوئے پرندوں کی طرح کیسے آپ کی جانب لپکتے ہیں۔

صاحبو! قرآن نے کہیں نہیں کہا کہ پرندوں والا واقعہ خدا کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق روبہ عمل بھی ہوا۔ اور سچی بات ہے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اپنے عہد میں اللہ کے نبی سے بڑھ کر مومن یعنی ذہین شخص کوئی نہیں ہوسکتا اور حضرت ابراہیمؑ بھی اعلیٰ ترین درجے کی ذہانت کے مالک تھے۔ طرفۃ العین میں آسمانی ہدایت کی تمثیلی جہت سے انہوں نے اپنے شعور کو منور کر لیا اور پھر کامل دلجمعی کے ساتھ دعوت کے عظیم پیغمبرانہ طریق پر گامزن ہو گئے۔ عین ممکن ہے وہ کسی مرحلے پر دل گرفتہ بھی ہوئے ہوں لیکن اس مفہوم نے انہیں حوصلہ ضرور عطا کیا ہوگا: ؎

مجھ کو اداس کر گیا جب کہ سلوکِ انجمن
اٹھ کے نگاہِ دلبری' ہاتھ میرا دبا گئی

(جاری ہے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آصف جلیل، کراچی
asif.jalil1@gmail.com

# حضرت انسان قرآن کے آئینے میں

(آخری قسط)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَ هُمْ (47:16)۔

**اور ان میں بعض تیری طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب تیرے پاس سے جاتے ہیں تو اہل علم سے پوچھتے ہیں کہ اس نے ابھی کیا کہا تھا؟ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور وہ اپنی خواہشوں کی پیروی کرتے ہیں۔**

اس آیت میں اس روش کا ذکر ہے کہ جب قرآن کریم کی بات کی جاتی ہے تو بظاہر لوگ سن رہے ہوتے ہیں لیکن انکا ذہن اسے تسلیم نہیں کر رہا ہوتا کیونکہ انہیں کچھ اور بتایا گیا ہوتا ہے۔ وہ تصدیق کے لئے اپنے مکتب فکر کے مذہبی رہنماؤں سے ان کی رائے لیتے ہیں جو اکثر قرآن کریم کے خلاف ہوتی ہے۔ قرآن کریم کو چھوڑ کر کسی اور کی بات کو معیار مان لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ ایسے لوگ دراصل اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ ہدایت کے سرچشمے (قرآن کریم) کو چھوڑ کر کہیں اور سے راہنمائی مل ہی نہیں سکتی۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ (47:26)۔

**یہ اس لیے کہ انہوں نے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ کی نازل کردہ وحی کو برا سمجھا یہ کہا کہ ہم بھی عنقریب بعض کاموں میں تمہارا کہا مانیں گے، اور اللہ ان کی پوشیدہ باتیں خوب جانتا ہے۔**

اس آیت میں بھی اس ذہنیت کا ذکر ہے جو اللہ کے نازل کردہ پیغام کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس کا تجربہ ان لوگوں کو اکثر ہوتا ہے جو صرف قرآن کریم کو معیار بنانے کی بات کرتے ہیں تو مذہبی پیشوا کس قدر غصے اور ناراضی کا اظہار

کرتے ہیں۔اس کے مقابلے میں انسانوں کا اتباع کرتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص یہ اطمینان کر لے کہ وہ ایسا تو نہیں کر رہا؟

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًابَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا (48:11)۔

**دیہاتیوں میں سے جو لوگ پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے وہ اب تجھ سے کہیں گے کہ ہم اپنے مال اور بال بچوں میں لگے رہ گئے پس آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کیجئے۔ یہ لوگ اپنی زبانوں سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، آپ جواب دیجئے کہ تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا بھی اختیار کون رکھتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو یا تمہیں کوئی نفع دینا چاہے تو، بلکہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے اللہ خوب باخبر ہے۔**

اس آیت میں اس روش کا ذکر ہے جس میں جنگ کے وقت بہانے بنا کر پیچھے رہ جانے والوں کا ذکر ہے۔ایسے لوگوں سے آج بھی واسطہ پڑتا ہے جو ویسے تو بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن وقت پڑنے پر وہ فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے وجہ بتا دی ہے کہ ان کی زبانوں پر وہ بات ہوتی ہے جو دل میں نہیں ہوتی۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدَاكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (49:17)۔

**اپنے مسلمان ہونے کا آپ پر احسان جتاتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اپنے مسلمان ہونے کا احسان مجھ پر نہ رکھو، بلکہ دراصل اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت کی اگر تم راست گو ہو۔**

اس آیت میں ان لوگوں کی ذہنیت بتائی گئی ہے جو اسلام کو وجہ بنا کر احسان جتاتے ہیں یا خود کو دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ایسے بے شمار لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جو دستار، داڑھی اور ماتھے پر پڑے داغوں کی وجہ سے احساس برتری کا شکار ہوتے ہیں اور عام لوگوں سے گفتگو کرنے کا انداز یہ ہوتا ہے جیسے وہ کسی کم تر سے بات کر رہے ہوں۔اسلام پر عمل کرنے کا فائدہ حاصل ہونے والے نتائج کی صورت میں ہوتا ہے۔یہ کوئی ذہنی تسکین یا خود فریبی نہیں ہے۔نہ اس کا مقصد اپنے آپ کو برتر سمجھنا ہے بلکہ یہ اخوت اور باہمی یگانگت پیدا کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ

عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلاَ مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ(58:14)۔

**کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا؟ جنہوں نے اس قوم سے دوستی کی جن پر اللہ غضبناک ہو چکا ہے، نہ یہ (منافق) تمہارے ہی ہیں نہ ان کے ہیں باوجود علم کے پھر بھی جھوٹ پر قسمیں کھا رہے ہیں۔**

اس آیت میں منافقانہ روش کا ایک اور پہلو بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے بھی دوستی رکھی جائے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہوں جو ظاہر ہے مفادات پر مبنی ہوگی۔ اس کے لئے جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہوئے اپنی عادت ہی بنالی جاتی ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (62:7)۔

**کہہ دیجئے کہ اے یہودیو! اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم اللہ کے دوست ہو دوسرے لوگوں کے سوا تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔ یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو اپنے آگے اپنے ہاتھوں بھیج رکھے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔**

یہاں اللہ کے دوست ہونے کے دعویداروں کی پہچان کے لیے ایک علامت بتائی گئی ہے کہ وہ موت سے کس حد تک خوف زدہ ہیں۔ ہر انسان اپنے بارے میں جانتا ہے۔ وہ چاہے ساری دنیا سے حقائق چھپا لے اپنے آپ سے نہیں چھپا سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس نے کونسے اچھے عمل کیے ہیں اور کون سے برے۔ اس طرح سے وہ اپنا حساب خود کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس خود فریبی میں مبتلا نہ ہو کہ اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے تو وہ یہ جانتا ہے کہ اس کے اعمال کا پلڑا کس طرف جھک رہا ہے۔ جس طرح ایک طالب علم کو اتنا اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ اس کے امتحان کا نتیجہ کیسا نکلے گا۔ اگر اس کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہوگا تو وہ چاہتا ہے کہ جلد از جلد نتیجہ نکلے۔ لیکن جسے فیل ہونے کی توقع ہو وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ نتیجہ نکلے ہی نہ۔ اسی طرح اگر اعمال اچھے ہوں تو موت سے کیا گھبرانا۔ اس سے مفر تو نہیں ہے۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ☆ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (67:10-11)۔

**اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے ہوتے یا عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے۔ پس انہوں نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ اب یہ دوزخی دور ہوں۔**

ان دو آیتوں کو سامنے رکھیں اور پھر ان لوگوں کی جرات کی داد دیں جو منبروں پر بیٹھ کر لوگوں کو بتا رہے ہوتے ہیں کہ

مذہب میں عقل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ویسے اگر اسلام کو مذہب قرار دے دیا جائے تو پھر یہ بھی دوسرے مذاہب کی طرح عقل سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام تو مذہب نہیں ہے بلکہ یہ مکمل نظام ہے جس کی رو سے ایک فلاحی مملکت قائم ہوتی ہے۔ عام لوگوں کو نہ تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین (نظام) ہے اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ حضرت اللہ تعالیٰ کی بات کو جھٹلا رہے ہیں۔

يُبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ ☆ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ☆ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُؤْيِهِ ☆ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ يُنْجِيْهِ (70:11-14)۔

**ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے، گناہ گار اس دن کے عذاب کے بدلے فدیے میں اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو اور اپنے بھائی کو اور اپنے کنبے کو جو اسے پناہ دیتا تھا اور روئے زمیں کے سب لوگوں کو دینا چاہے گا تاکہ یہ اسے نجات دلا دے۔**

یہاں مجرموں کی وہ کیفیت بتائی گئی ہے جو ظہور نتائج پر ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت آ گئی ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی کسی دوسرے کے جرم کی سزا بھگت سکے۔ ایک شخص کا عمل دوسرے کے کام نہیں آ سکتا۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ حج بدل کرنے سے یا قرآن خوانی سے مرنے والے کو ثواب پہنچتا ہے۔

وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا (71:7)۔

**میں نے جب کبھی انہیں تیری بخشش کے لیے بلایا انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑوں کو اوڑھ لیا اور اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔**

آج اگرچہ انگلیاں کانوں میں دینے کی نوبت تو نہیں آتی کیونکہ بغیر سوچے سمجھے سننے میں تو کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ جس طرح قرآن کریم پڑھا اور سنا جاتا ہے دنیا کی کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہوگی، بات سوچنے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ہے جس پر آج بھی اکثریت کا وہی ردعمل ہے جو اس آیت میں آیا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ☆ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (75:20-21)۔

**نہیں نہیں تم جلدی ملنے والی (دنیا) کی محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔**

ان آیات میں انسانوں کی عام روش کا ذکر ہے کہ وہ مفاد عاجلہ کو اہمیت دیتے ہیں لیکن مستقبل کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہمارے اردگرد بہت سے لوگ ہیں جو صرف اسی لئے مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں کہ وہ آج کے فائدے کی

خاطر کل ہونے والے نقصان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر عمل کرنے سے پہلے نتائج پر نظر رکھی جائے تو بہت سی غلطیوں سے بچا جا سکتا ہے۔ یہی بات آج ماہر نفسیات سٹیفن کوی بتا رہا ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ☆ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ☆ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ☆ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ☆ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ☆ (83:1-6)۔

**بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب انہیں ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد اٹھنے کا خیال نہیں۔ اس عظیم دن کے لئے۔ جس دن سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔**

ان آیات میں محض ناپ تول کی بات نہیں ہے بلکہ دوہرے معیار اور پورا حق نہ دینے کی ہے۔ یعنی لوگ چاہتے ہیں کہ وہ جس طرح کا معاملہ دوسروں کے ساتھ کر رہے ہیں، دوسرے ان کے ساتھ ویسا نہ کریں۔ ہمارے معاشرے میں جتنی بھی سیاسی، معاشی یا معاشرتی ناہمواریاں ہیں ان کا واحد سبب ان آیات کی خلاف ورزی ہے۔ سیاسی اور مذہبی لیڈر اور حکومتی اہلکار عیش کر رہے ہیں مگر عوام ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے کہ ان کا مرنے کے بعد کی زندگی پر اعتماد نہیں ہوتا۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ☆ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (83:10-12)۔

**اس دن جھٹلانے والوں کی بڑی خرابی ہے۔ جو جزا اور سزا کے دن کو جھٹلاتے رہے۔ اسے صرف وہی جھٹلاتا ہے جو حد سے آگے نکل جانے والا (اور) گناہ گار ہوتا ہے۔**

مکافاتِ عمل (یعنی آخرت) پر ایمان کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ یہاں جھٹلانے والوں کا ذکر ہے، انکار کرنے والوں کا نہیں۔ جو لوگ زبان سے اقرار کرتے ہیں لیکن ان کا عمل اس کے خلاف ہو تو ان کا شمار مکذبین میں ہوتا ہے۔ اب ہمیں جائزہ لینا ہوگا کہ ہمارا شمار کن میں ہوتا ہے۔ لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آخرت پر حقیقی ایمان کسی کا نہیں۔

آخر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ میں نے کوشش کی ہے کہ ان تمام آیات کو یکجا کر دوں جن میں انسانوں کی نفسیات اور طرزِ عمل کا ذکر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سی آیات رہ بھی گئی ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ ان آیات کی روشنی میں ہم سب اپنا اور دوسروں کا جائزہ لیں اور ان غلطیوں سے بچیں جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

# ایک آیہ کریمہ کی مذہبی اور دینی تفسیر

خلافتِ راشدہ کے بعد چونکہ ہمارے ہاں ملوکیت بری طرح غالب آ گئی تھی، اس لئے ہم مسلمانوں کے ذہن سے دین کا تصور بالکل محو ہو گیا۔ ہم مسلمانوں کی مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ ہمارا تمام علمی لٹریچر، تفاسیر، احادیث کے مجموعے، فقہی قوانین سب دورِ ملوکیت میں مذہبی نقطۂ نگاہ سے تحریر کئے گئے۔ تحریک طلوع اسلام کے زیر اثر، اب جو دین کی آواز بلند ہوئی ہے، اور حالات کے تقاضوں کی وجہ سے بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے، تو وہ آواز اس بات کی بھی متقاضی تھی کہ قرآن کریم کی تفاسیرِ دینی نقطۂ نگاہ سے پیش کی جائیں۔ ادارہ طلوع اسلام نے اس تقاضہ کو بھی پورا کیا اور قرآن کریم کی دینی تفسیر مفہوم القرآن، مطالب الفرقان، دروس القرآن، کے عناوین سے طبع کیں جو قرآنی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہمارے روایتی مذہبی دارلعلوموں اور علماء کرام میں بھی وہ بغور مطالعہ کی جاتی ہیں۔ ہمارا مذہبی طبقہ اور ہماری پیشوائیت اس بات پر اعتراض کرتی ہے کہ اگر یہ طلوع اسلام کی فراہم کردہ تفاسیر درست ہیں تو کیا وہ سابقہ تمام تفاسیر غلط تھیں، اور اس طویل عرصہ کے وہ سارے مفسرین گمراہی کے شکار تھے۔ طلوع اسلام اور قرآنی حلقوں سے متعلق حضرات کا قطعاً یہ خیال نہیں ہے۔ ہم ان سارے مفسرین کرام کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ ان تمام مفسرین نے نہایت نیک نیتی اور محنت شاقہ کے بعد وہ تفاسیر تحریر فرمائیں۔ اگر آپ مذہب کے نقطۂ نگاہ سے ان کا آج بھی مطالعہ فرمائیں، تو یقیناً وہ آپ کو فائدہ دیں گی لیکن ان کی خامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اگر آپ قرآن کریم کو مذہب کا داعی قرار نہیں دیتے، اور دین کا داعی قرار دیتے ہیں تو یہ تفاسیر کسی طرح بھی قرآنی تعلیم کے مطابق قرار نہیں دی جا سکتیں۔ اس میں آپ کو ایک موقف اختیار کرنا پڑے گا سابقہ مفسرین کرام چونکہ ملوکیت اور مذہب کے دور میں پیدا ہوئے، ان کے چاروں طرف مذہب اور ملوکیت نے گھیرا ڈالا ہوا تھا وہ اس گھیرے سے باہر نکل ہی نہیں سکے۔ اس ایک ہزار سال کے اندر ہمارے ہاں جس قدر تحریکات برپا ہوئیں وہ سب مذہب کی داعی ہیں۔ دین تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ وہ حضرات سب اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ مذہب کو درست کر لیں گے، تو اس سے دین کے نتائج برآمد ہو جائیں گے، لیکن حقیت یہ ہے کہ مذہب کو ٹھوک پیٹ کے درست کرنے

سے وہ دین نہیں بن جاتا۔ دین تو مذہب کا بالکل نقیض ہے۔ جب مذہب ختم ہوگا تو دین اس کی جگہ آئے گا اور اس کے نتائج برآمد ہوں۔

مذہب کا ایک سب سے بڑا سقم یہ ہے کہ اس کے نتائج اس دنیا میں برآمد نہیں ہوتے۔ دین کے نتائج اسی دنیا میں برآمد ہوتے ہیں اور ان نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم درست راہ پر ہیں یا نہیں۔ قرآن کریم کی جن آیات کے نتائج یہاں برآمد ہونے تھے' جب ان کی تفسیر مذہب کی رو سے کی گئی تو ان کے نتائج کو آخرت پر ملتوی کر دیا گیا۔ اس سے قرآن کریم کے دعاوی کو یہاں Test کرنے کا امکان جاتا رہا ہے۔ قرآن کریم کے دعاوی اگر اس دنیا میں ہمارے سامنے پورے ہونے لگیں' تو وہ خود قرآن کریم کی صداقت کی دلیل بن جاتے ہیں' قرآن کریم نے فرمایا:

وَأَنتُمُ الأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِيْنَ(3:139)-

اگر تم مومن ہو تو تم غالب رہو گے۔

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (3:110)-

تم کیا اچھے گروہ ہو کہ لوگوں کی ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے ہو' تم لوگوں کو اچھے کام کا حکم کرتے ہو' اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

اسی طرح ارشاد ہوا:

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً لِّتَكُونُواْ شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ (2:143)-

اور اسی طرح تم کو امۃ وسطیٰ بنایا تاکہ تم لوگوں کے نگران بنو۔

یہ وہ آیات کریمات ہیں جن کا اس دنیا سے تعلق ہے' لیکن آپ ان کی تفاسیر مطالعہ فرمائیں ہمارے مفسرین کرام نے' ان کو قیامت اور آخرت پر ملتوی کر دیا ہے جس کا نقصان یہ ہوا کہ اس کے نتائج یہاں برآمد نہیں ہوئے۔

سورۃ نور میں قرآن کریم نے فرمایا کہ اگر تم ایمان لائے اور تم نے اعمال صالحہ کئے تو اللہ کا وعدہ ہے کہ:

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ (24:55)-

تم کو ضرور اس دنیا میں اقتدار دے گا۔

اس آیت میں ارض (زمین) کا لفظ لا کر واضح کر دیا کہ یہ غلبہ و اقتدار اسی زمین میں حاصل ہوگا۔ ایمان اور عمل صالحہ کا نتیجہ اسی دنیا میں برآمد ہوگا' اس کا آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد آپ کے سامنے ایک آیۂ کریمہ کی مذہبی اور دینی تفسیر پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

سورۃ توبہ میں ارشاد عالی ہوتا ہے:

إِنَّ اللّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنفُسَهُمْ

وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ (9:111)-
اس میں تو شک ہی نہیں کہ خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ ان کی قیمت ان کے لئے جنت ہے۔

ہمارے ہاں اس طویل عرصہ میں جس قدر تفاسیر تحریر کی گئی ہیں وہ سب ایک دوسرے کا چربہ ہیں۔ سب کے شانِ نزول بھی تقریباً ایک جیسے ہیں۔ بیشتر آیات کے دو دو، تین تین، چار چار شانِ نزول ہیں، لیکن آیات کی تفسیر تقریباً ایک جیسی ہے۔ اس لئے آپ کے سامنے اس آیہ کریمہ کی صرف دو تفاسیر پیش کی جائیں گی کیونکہ باقی تفاسیر میں بھی یہی کچھ تحریر ہے، اس کے بعد اس آیت کی دینی تفسیر پیش خدمتِ عالی کی جائے گی۔

(1) حضرت اقدس جناب پیر کرم شاہ صاحب کی مشہور تفسیر ''ضیاء القرآن'' میں تحریر ہے:

''جب ستر انصار مکہ میں آئے اور رات کو تنہائی میں حضور کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر وہ تاریخی بیعت کی جسے بیعتِ عُقبہ ثانیہ کہا جاتا ہے تو اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ نے عرض کی۔ اے اللہ کے نبی، جو شرط آپ اپنے رب کے لئے اور اپنی ذات کے لئے ہم سے منوانا چاہتے ہیں منوا لیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لئے تو یہ شرط ہے: **ان تعبدوہ، ولا تشرکوا بہ شیئاً**۔ کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ اور اپنے لئے یہ شرط ہے۔ **ان تمنعونی مما تمنعون منه انفسکم واموالکم**۔ کہ جس چیز سے تم اپنے جان و مال کی حفاظت کرتے ہو، اس سے میری حفاظت کرو۔ انصار نے عرض کی کہ اگر یہ شرطیں ہم نے پوری کر دیں تو ہمیں کیا ملے گا۔ فرمایا: جنت۔ اس وقت خوشی سے ان کے دل باغ باغ ہو گئے اور کہنے لگے۔ **ربح البیع لا نقیل ولا نستقیل**۔ یہ سودا تو بڑا نفع مند ہے۔ ہم اب اس سودے کو نہ توڑیں گے اور نہ اس کو توڑنے کی آپ سے خواہش کریں گے۔ اس وقت یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی۔''

(2) تفسیر عثمانی میں تحریر ہے:

''اس سے زیادہ سود مند تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیر سی جانوں اور فانی اموال کا خداوندِ قدوس خریدار بنا............ اور جنت جیسے اعلیٰ ترین مقام کو اس کا ثمن بتلایا۔''

اس آیۂ کریمہ کی جس قدر تفاسیر آپ ملاحظہ فرمائیں گے، سب میں قدر مشترک یہی ہے کہ یہ آیات جہاد کی ترغیب کے لئے نازل ہوئیں کہ جو شخص اپنے نفوس و اموال کے ساتھ جہاد کرے گا، اس کو آخرت میں جنت مل

جائے گی۔ نتیجہ اس کا آخرت میں ہوگا' اس دنیا میں نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس تفسیر میں وہی خامی ہے جو مذہب میں ہے کہ اس کے نتائج کو آخرت پر ملتوی کردیا جاتا ہے۔ جہاد کے جو نتائج وفوائد مسلمانوں کو اس دنیا میں حاصل ہونے چاہئیں انہیں آخرت پر ملتوی کردیا گیا ہے۔ نیز یہ کہ اس آیت کا ہم سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ حضورﷺ کے دور میں ایک واقعہ ہوا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ غور کرنے کی بات تو یہ ہے کہ اس آیت کا اطلاق ہم سب مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے آج بھی جان واموال خرید سکتا ہے اور اس کے بدلے جنت دے سکتا ہے۔ ہم میں سے کتنے لوگوں نے جان و مال کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کیا اور جنت خرید کی۔ اس آیتِ کریمہ پر غور کرتے وقت جس بات پر یقین رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ معاہدہ کوئی محض دینی' اعتقادی' وقتی معاہدہ نہیں تھا۔ اس بیع وشری اور اس معاہدہ کا ہم سے بھی اسی طرح تعلق ہے جس طرح حضورﷺ کے دور میں صحابہ کرامؓ سے تھا۔ جس طرح انہوں نے اپنے جان اور مال فروخت کرکے' اپنے دور میں اس دنیا میں بھی جنت حاصل کی تھی۔ (39:74)۔ اسی طرح ہم پر بھی فرض ہے کہ ہم اپنے جان و مال فروخت کر کے' مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور تمام انسانیت کے لئے عموماً' اس دنیا کو بھی جنت کی دنیا بنادیں۔

آیہ کریمہ میں تین نکات غور طلب ہیں۔

(1) اللہ سے عملی طور پر کیا مراد ہے؟

(2) فی سبیل اللہ سے کیا مراد ہے؟

(3) آیہ کریمہ میں جنت سے کیا مراد ہے؟

1- جن حضرات کی نگاہ تحریک طلوع اسلام پر ہے انہیں بخوبی علم ہے۔ اس تحریک کے نزدیک انسانوں کی دنیا میں اللہ کے کام انسانوں کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ جب مسلمانوں کی بیشتر آبادی ہجرت کرکے مدینہ چلی گئی اور وہاں انہوں نے اپنی حکومت قائم کرلی جس کی وجہ سے وہ کفار مکہ کے ظلم وستم سے محفوظ ہوگئے لیکن مدینے کے کمزور لوگ برابر ان کے جوروستم کے نشانہ بنتے رہے اور وہ اپنے خدا سے' دعا کرتے رہے کہ وہ انہیں کفارِ مکہ کے ظلم وستم سے نجات دلائے۔ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ ان کی مدد کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے مدینہ کی جماعتِ مومنین کو کہا کہ:

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ الخ (4:75)-

اور مسلمانو تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ خدا کی راہ میں ان کمزور اور بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کے واسطے جہاد نہیں کرتے اور جو خدا سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اے ہمارے پالنے والے کسی طرح اس بستی سے جس کے باشندے بڑے ظالم ہیں ہمیں نکال اور اپنی طرف سے کسی کو ہمارا سرپرست بنادے۔

2- اسی طرح بیعتِ رضوان میں ہوا کہ مجاہدین حضورﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے لیکن اس بیعت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ (48:10)-

اے رسول یہ مجاہدین جو تجدید عہد کے لئے تیرے ہاتھ پر معاہدہ کر رہے ہیں تو یہ معاہدہ تیرے ساتھ نہیں ہوتا خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔ توثیق عہد کے لئے جو تو ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہے تو وہ تیرا ہاتھ نہیں ہوتا' خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔

3- اسی طرح جب بدر کے میدان میں مجاہدین غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیراندازی کر رہے تھے تو اس کے متعلق بھی ارشاد ہوا:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللّهَ رَمَى (8:17)-

یہ تیراندازی تم نہیں کر رہے تھے اللہ کر رہا تھا۔

4- اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ:

لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ (58:21)-

میں اور میرے رسول ضرور غالب رہیں گے۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ ہم اپنے کلمہ کو ہر حال میں بلند رکھیں گے۔

وَكَلِمَةُ اللّهِ هِيَ الْعُلْيَا (9:40)-

اللہ کا کلمہ ہی غالب ہے۔

خدا کا دین تمام ادیان پر غالب رہے گا(9:33)-

ظاہر ہے کہ کلمتہ اللہ کا غلبہ' دین خداوندی کی بلندی' بدر وحنین کے معرکوں میں حضورﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوئی ہے۔

ان مقامات کو پیش کرنے سے یہ غرض ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے' اس سے عملی طور پر (نظام) حکومت مراد ہوتی ہے جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔ وہ حکومت ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے سر لیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور اس کے بدلے افراد معاشرہ وہ تمام فرائض و واجبات پورے کرتے ہیں جن کا عہد انہوں نے خدا سے کیا ہوتا ہے۔

اس میں دوسرا قابل غور نکتہ **فی سبیل اللہ** ہے۔ ہمارے ہاں اس کا ترجمہ اللہ کی راہ کر کے' نیک عملی مراد لی جاتی ہے۔ مفاد عاجلہ میں جو کام سرانجام دیئے جائیں وہ بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے اور اس کے مقابلہ میں **فی سبیل الطاغوت** لایا گیا ہے (4:74)- مومنین کی جماعت **فی سبیل اللہ** جنگ کرتی ہے اور کفار کی جماعت **فی سبیل الطاغوت** جنگ کرتی ہے۔ اس سے **فی سبیل اللہ** کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ طاغوت سے مراد وہ نظام حکومت ہے

جس میں انسان کے اپنے وضع کردہ قوانین جاری ہوں' اس لئے **قتال فی سبیل** سے مراد' اسلامی حکومت کے قیام کے لئے قتال ہے۔

اس آیہ کریمہ میں تیسرا حکم جو قابلِ غور ہے وہ جنت کا لفظ ہے۔ قرآنِ کریم کا وعدہ ہے کہ جو معاشرہ قرآنی احکامات کے مطابق قائم ہوگا وہ اس دنیا میں جنتی معاشرہ ہو گا۔ قرآنِ کریم نے جس طرح عالم امر اور عالم خلق میں تفریق کی ہے اسی طرح قرآن نے جنتیں بھی دو فرمائی ہیں' ارشاد ہوتا ہے:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ(55:46)-

اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا رہا' اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔

انسان کو جادۂ مستقیم پر قائم رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے حضور کی پیشی کا خوف ہے یہ خوف دل سے نکل جائے تو پھر انسان کو جرائم سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ فرمایا کہ: جو لوگ اپنے رب کے حضور جواب دہی سے ڈرتے ہیں اور معاشرہ میں کسی قسم کا جرم نہیں کرتے ان کے لئے دو جنتیں ہیں۔ ایک جنت اس دنیا میں اور دوسری جنت آخرت میں۔

جس گھر میں میاں بیوی کے خیالات ونظریات میں ہم آہنگی ہوتی ہے اور ان کی زندگی امن و امان سے گذرتی ہے اور وہ Harmonion Life گذارتے ہیں۔ قرآن کریم اس گھر کو جنت کے نام سے پکارتا ہے۔ فرمایا: اور مسلمانو تم مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو۔ مشرکہ عورت تمہیں اپنے حسن و جمال سے کیسی ہی اچھی معلوم نہ ہوتی ہو مگر پھر بھر ایمان دار عورت اس سے ضرور اچھی ہے اور مشرکین جب تک ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں ان کے نکاح میں مت دو اور مشرک تمہیں کیسا ہی اچھا معلوم نہ ہو' مگر پھر بھی بندہ مومن اس سے ضرور اچھا ہے کیونکہ أُولَـٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُوَ إِلَى الْجَنَّةِ (2:221)- جس گھر میں آرام ہوگا اس کو قرآن نے جنت اور جس میں تصادم ہوگا اس کو جہنم بیان فرمایا ہے۔ سورۃ توبہ میں ایمان' ہجرت اور جہاد کے نتیجہ میں ارشاد ہوا کہ:

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ(9:21)-

ان کا پروردگار' مہربانی' خوشنودی اور جنّات کی خوش خبری دیتا ہے جن میں ان کے لئے دائمی عیش ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کے مسلسل جہاد کے نتیجہ میں انہیں دشمنوں کی زمینوں' ان آبادیوں اور ان کے مال و دولت کا مالک بنا دیا (33:27)- چنانچہ جب ان صحابہ کرامؓ کو فتوحات حاصل ہوتی تھیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے کہتے تھے:

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ

وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاء فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْنَ (39:74)-
اور (صحابہ کرام) کہتے تھے کہ خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ ہم کو سچ کر دکھایا اور ہمیں جنت کی زمین کا مالک بنا دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں رہیں اور کام کرنے والوں کا یہ کیسا عمدہ اجر ہے۔

صلح حدیبیہ کے بارے میں جو آیات سورہ فتح میں نازل ہوئیں' اس میں صحابہ کرامؓ کو تسلی دی گئی کہ اس موقع پر رب پر صلح کرنے سے دل برداشتہ نہ ہو۔ یہ صلح حدیبیہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوگی اور عنقریب خدا تمہیں فتح عطا فرمائے گا: لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِيْ مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ (48:5)- تاکہ وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان جنّات میں داخل کرے جن کے نیچے آب رواں جاری ہے تاکہ ان کے مخالفین کو شکست کا عذاب ہے (46:6)-

قرآنِ کریم میں یہ وہ مقامات ہیں جن میں جنتِ ارضی کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یہ جنت ارضی اسلامی نظام قائم کرنے کے بعد' اسی دنیا میں قائم ہوئی تھی' اور آج بھی اسی طرح قائم ہوسکتی ہے۔ اور یہ اس معاہدہ کا نتیجہ ہوتی ہے جس کا وعدہ زیرغور آیت میں کیا گیا ہے۔

حضورﷺ کے مخالفین حضورﷺ سے کہتے تھے کہ اگر آپ حقیقت میں اللہ کے رسول ہیں تو تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيْلٍ وَعِنَبٍ (17:91)- تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہونا چاہئے اس کے جواب میں قرآنِ کریم نے فرمایا کہ یہ کفار ایک جنت (باغ) کا مطالبہ کرتے ہیں خدا تمہیں کئی جنّتیں عطا کرے گا۔ جَعَلَ لَكَ خَيْراً مِّن ذَلِكَ جَنَّاتٍ' ایک باغ تو کیا چیز ہے اس سے بہتر بہت سے باغ تمہیں عنایت کرے گا۔ يَجْعَل لَّكَ قُصُوراً (25:10)- ان تمام باغات کے علاوہ تمہیں محلات بھی عنایت فرمائے گا' یہ تمام کامیابیاں' اللہ تعالیٰ سے جان و مال حاضر کرنے کے معاہدہ کے سبب حاصل ہوتی ہیں۔

ہمارے مفسرین کرام نے' اس آیہ کریمہ کو خاص حالات کے ساتھ منسلک کر کے' اس کی عمومیت' ابدیت' عالمگیریت کو بالکل محدود کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس کو صرف ایک ذہنی و اعتقادی معاہدہ قرار دیا ہے جس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی وجہ سے آج کی دنیا میں ہم مسلمانوں کا اس سے دور دور کا کوئی واسطہ نہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں پیروں سے بیعت کا سلسلہ جاری ہے۔

اس آیہ کریمہ کی جو تشریح ہماری سابقہ تفاسیر میں دی گئی ہے وہ سب مذہب کے زیر اثر کی گئی ہیں۔ دین کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام لازمی و لابدی شے ہے۔ اس اسلامی حکومت سے اس کے شہری' یعنی مومنین'

اس اسلامی حکومت سے معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ اسلامی نظام کو قائم کرنے' اور اس کو جاری رکھنے کے لئے اپنی جان و اموال کو ہر وقت اسلامی حکومت کے سپرد کرنے کو تیار ہیں۔ اور ان کی ان قربانیوں اور ان کے ایثار کا یہ نتیجہ ہے کہ اس دنیا میں انہیں جنت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ جنت ارضی' قرآنی معاشرہ کا دوسرا نام ہے جس میں نہ صرف ہر شخص کو رزق فراہم ہوگا بلکہ انسانی ذات کی نشوونما بھی ہوتی چلی جاتی ہے اور اس نشوونما کی وجہ سے آخرت کی جنت تک رسائی ہوگی کیونکہ موت کے بعد اس دنیاوی زندگی کا سارا سامان یہاں ہی رہ جائے گا اور صرف انسانی ذات آگے جاتی ہے۔ جس ذات کی نشوونما اس جنتِ ارضی میں ہو چکی ہوگی وہ ہی زندگی کے اگلے مراحل طے کرتا چلا جائے گا' ان آئندہ کے مراحل کو بھی قرآن کریم نے جنت کی زندگی کہا ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر محمد امین ضیاء، فیصل آباد

# قرآن فہمی یا قرآن خوانی

مکرمی! آج میں جس عنوان کے تحت کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں' اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے مذہبی پیشواؤں نے ہمیں قرآن خوانی کی تلقین کی ہے قرآن فہمی کا درس نہیں دیا کیونکہ وہ خود بھی قرآن خوان تھے قرآن فہم نہ تھے' نتیجہ یہ نکلا کہ آج تک ہم بھی قرآن سے دور ہیں اور ہمارے مولوی حضرات بھی قرآن سے کوسوں دور ہیں اور ہم قرآن مجید سے کوئی استفادہ نہیں کر سکے ہیں۔ ہمارے مولویوں نے ہمیں اس خوش فہمی میں ڈال دیا کہ تم قرآن کو بے شک سمجھو یا نہ سمجھو بس پڑھتے ہی چلے جاؤ اگر پڑھ نہ سکو تو الفاظ پر خالی انگلیاں ہی پھیرتے جاؤ اس قدر ثواب ملے گا کہ دین و دنیا کی برکات سے مالا مال ہو جاؤ گے اگر کسی وجہ سے تمہیں دنیا میں کچھ نہ ملا تو آخرت میں تم کو انعام و اکرام دلا دیا جائے گا۔ تمہارے لئے جنت میں نہ صرف لاتعداد محلات ہوں گے بلکہ وہاں درجنوں کے حساب سے حوریں ہوں گی اور اس طرح کے بہت سے انعام و اکرام کے متعلق خوشخبری دی لہٰذا ہم نے یہ سوچا کہ جب قرآن کو صرف پڑھنے سے یا اس کے الفاظ پر انگلیاں پھیرنے سے ہی سب کچھ مل جائے گا تو پھر سمجھ کر پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مولوی حضرات کے Mis-Guide کرنے کی وجہ سے مسلمان بغیر سمجھے ہی پڑھتے چلے جا رہے ہیں روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر کسی کو بھی نہیں پتہ کہ جو روزانہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اس کا کیا مطلب ہے اس میں ہمارے لئے کیا حکم ہے کیا پیغام ہے اس پیغام کو پڑھ کر یا حکم کو پڑھ کر ہم نے کیا کرنا ہے یا ہمیں کیا کرنے کے لئے اللہ نے اس قران میں کیا حکم دیا ہے' ہمیں کچھ پتہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تلاوت قرآن کرنے والوں کی 99 فیصد تعداد قرآن کے مطالب و مفاہیم اور اغراض و مقاصد سے بے بہرہ ہیں۔ آج بھی ہماری مسجدوں میں قرآن کو نہ سمجھ کر پڑھنے پر بھی انعام و اکرام' حوروں کی یقین دہانی کرائی جا رہی ہے۔ مولوی حضرات جمعہ کے خطبوں میں بھی قرآن فہمی کی بات نہیں کرتے بلکہ قرآن کو بطور تعویذ پیش کرتے ہیں کہ اس کے صرف پڑھنے سے ہی تم دنیا و آخرت میں مالا مال ہو جاؤ گے۔ مسلمانوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں کی امامت کا فریضہ ادا کرنے والے لوگ خود بھی نہیں سمجھتے کہ قرآن کے جو الفاظ ہیں وہ مسلمانوں پر نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ کیوں اتارے گئے ہیں۔ ان الفاظ میں کیا ہے مسلمانوں

نے ان الفاظ کی مدد سے کس طرح زندگی سنوارنا ہے اللہ کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ ہمارے امام حضرات مسلمانوں کو قرآن سمجھانے میں ناکام رہے۔صرف قرآن خوانی کی ہی تلقین کرتے رہے اور جنت میں گھر بنواتے رہے جس کی وجہ سے مسلمانوں نے قرآن کے ذریعہ کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کر سکے۔ مولوی حضرات کہاوتوں' روایات' جھوٹی سچی کہانیاں' سنی سنائی باتوں پر ہی وعظ فرماتے رہے۔قرآن کے مطالب ہرگز نہ بتا سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سچے اور اصل مسلمان نہ بن سکے۔ قرآن میں جو حکم تھا اس پر عمل نہ کر سکے۔ آج کا مسلمان قرآن کے مخالف سمت چلتا ہوا نظر آتا ہے۔قرآن میں زکوٰۃ کا حکم ہے مسلمان زکوٰۃ کٹنے سے ایک دن پہلے بینک سے رقم نکلوا لیتے ہیں۔قرآن میں صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم ہے دو فیصد مسلمان نماز محض رسم کے طور پر پڑھتے ہیں۔ صلوٰۃ قائم نہیں کرتے۔ ہر نماز کے بعد خدا سے کیا گیا عہد یا کی ہوئی بات توڑ دیتے ہیں۔نماز میں جھکا یا ہوا سر نماز کے بعد دوبارہ خدا کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں۔حقوق العباد کی خلاف ورزیاں کرتے ہوئے قرآن کے منکر بن جاتے ہیں حتیٰ کہ دنیا کے تمام معاملات ہی قرآن کے الٹ کرتے ہیں جب سب کچھ ہی قرآن میں درج احکامات و پیغامات کے الٹ کرنا ہے تو پھر بار بار اور روزانہ قرآن خوانی کا کیا مقصد رہ جاتا ہے۔ گو سارے مسلمان ایسا نہیں کرتے مگر 99 فیصد مسلمان ایسا ہی کرتے ہیں جو مسلمان قرآن کو سمجھ سمجھ کر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں وہ فلاح پا رہے ہیں اور جو مسلمان ایسا نہیں کر رہے وہ محض وقت ضائع کر رہے ہیں اور خدا کے عذاب کو آواز دے رہے ہیں۔ قرآن ایک ضابطۂ حیات ہے جو انسانی حیات کے لئے خدا نے مرتب کیا ہے اگر قرآن کے ضابطے لاگو نہیں ہوتے تو پھر کونسی حیات رہ جاتی ہے۔ باقی تو پھر درندگی ہی درندگی رہ جاتی ہے۔ قرآن صرف بار بار قرآن خوانی کے لئے نہیں اترا عمل کر کے زندگی سنوارنے کے لئے اترا ہے۔ جب ہم اس کلام کو سمجھ کر پڑھیں گے اور قرآنی احکامات کو اپنی زندگی پر لاگو کر لیں گے تو پھر ہم پر اللہ بھی راضی ہوگا اور موجودہ ذلتوں سے بھی نکل آئیں گے وگرنہ سب عبادتیں جھوٹی' فرماں برداریاں جھوٹی' محبتیں محض منافقت ہی ہوں گی قرآن مجید ختم دلانے یا تعویذ گنڈا کرنے یا دم درود کے لئے نہیں اترا' قرآن تو ایک حکم ہے جو کہ خدا کی طرف سے ہے جس کو ہم نے سمجھا ہے اور خدا کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ قرآن سے اگر کوئی اجر یا ثواب حاصل ہوتا ہے تو وہ عمل کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ جب قرآنی آیات پر عمل ہی نہیں کرنا تو پھر خالی خولی پڑھنے سے کیا ثواب ہوتا ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اگر ہم آیات کو پڑھ کر عمل نہیں کریں گے تو ہوسکتا ہے عذاب کے مستحق بن جائیں اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے ہم میں سے اکثر تلاوت روزانہ کرتے ہیں اور

زندگی اس تلاوت کے الٹ گزار رہے ہیں کیونکہ ہمیں پتہ ہی نہیں کہ جو تلاوت ہم نے کی ہے اس کا کیا مطلب ہے یا اس میں ہمارے لئے کیا حکم ہے کیونکہ ہم نے تو تلاوت دس نیکیاں فی لفظ کے حساب سے حاصل کرنے کے لئے کی ہے ہم اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ آج ہم نے آدھ پارہ تلاوت کر کے تقریباً 20 لاکھ نیکیاں حاصل کر لی ہیں لہٰذا آج ہم جو بھی گناہ کریں گے یا جو بھی برا کام کریں گے اس کا گناہ ان نیکیوں سے تو کم ہی ہوگا۔ خدارا اصلی راستہ پر آ جائیں غلط نظریہ ترک کر دیں اور یہ نظریہ قائم کر لیں کہ قرآن کی آیات پر عمل کریں گے تو ثواب ہوگا وگرنہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قرآن مجید سمجھ سمجھ کر پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(روزنامہ دن لاہور، یکم نومبر 2006ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورۃ الجن

(آیات 1 تا 15)

عزیزانِ من! آج جنوری 1984ء کی چھ تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الجن سے ہو رہا ہے۔ یہ 72 ویں سورۃ کا آغاز ہے۔

## عربی لغت کے تحت ''جن'' کا مفہوم

بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ جونہی وہ سننے میں آئیں یا دیکھنے میں آئیں' ان کے اندر جو ایک مضمر مفہوم چلا آتا ہے' وہ ہمارے ذہنوں سے ایسا چپکا ہوا ہوتا ہے کہ ہم اس کی کوشش اور کاوش ہی نہیں کرتے کہ اس لفظ کے صحیح معنی معلوم کریں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جو پہلے سے متصور معنی ہوتے ہیں' وہی ذہن کے اندر آ جاتے ہیں۔ ان الفاظ میں ''جن'' کا لفظ تو بہت ہی زیادہ طاقتور ہے۔ لہٰذا ''جن'' کا لفظ جس وقت بھی کسی کی زبان پر آتا ہے تو اپنے اپنے تصور کے مطابق فوراً ایک خاص شکل سامنے آ جاتی ہے۔ پہلے تو پھر بھی یہ متخیلہ کے خاکے ہوتے تھے اور اب ٹی وی (ٹیلی ویژن) کے طفیل تو ان کی مجسم شکلیں سامنے آ جاتی ہیں۔ اس سے ہماری آنے والی نسلیں تو اپنی آنکھوں کے سامنے ''جن'' دیکھ لیتی ہیں اور ہمارے ذہنوں میں ''جن'' کے جو معنی پیوست ہوتے ہیں' وہ ذہن سے الگ ہی نہیں ہوتے۔ اب بھی میں نے سورۃ جن کہا ہے تو ''جن'' کے لفظ سے آپ کے ذہن میں فوراً وہی کچھ آ گیا۔ ایسے الفاظ کے متعلق ضروری ہوتا ہے کہ انہیں ذرا غور سے دیکھا' سنا اور سمجھا جائے۔ اصل میں یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور اس کا مادہ ''ج ن ن'' ہے جس کے بنیادی معنی ہیں: ''ہر وہ شے جو نگاہوں سے

اوجھل ہو'' [1] اس طرح جب تک کوئی چیز نگاہوں سے اوجھل ہو وہ ''جن'' رہتی ہے اور جب وہ نگاہوں کے سامنے آ جائے تو پھر وہ جو کچھ ہوتی ہے وہ وہی کچھ بن کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں انسانی زندگی یا زندگی کی جو ارتقائی منازل آئی ہیں' ان کے متعلق سائنس کے انکشافات نے یہ چیز بتائی ہے کہ جب یہ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھی ہے تو یہ سائنسدان اسے بن مانس تک لے آئے ہیں اور اس کے بعد جب یہ آگے بڑھی ہے تو وہ اسے اُس مخلوق تک لے آئے جسے وہ چمپانزی (Chimpanzee) کہتے ہیں اور اس کے بعد ان کی تحقیق کے مطابق پھر انسانی پیکر آتا ہے۔ اب تک ان کی تحقیق یہ ہے کہ درمیان میں ایک Missing Link (گم شدہ کڑی) ہے یعنی ارتقا کی ایک کڑی ایسی ہے کہ جو ابھی تک سامنے نہیں آ سکی۔ اس کے متعلق یہ لوگ بڑی کاوش کر رہے ہیں اور ان چیزوں کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں کہ جو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں آتیں کہ آیا وہ اس قابل ہیں کہ ان پہ تحقیق کی جائے۔ یہ لوگ اس تحقیق و تدقیق پہ چلے گئے ہیں' وہ کہیں افریقہ کے صحراؤں اور کہیں آسٹریلیا کے جنگلوں میں کھدائی کر رہے ہیں یا پھر کہیں کہیں ہڈیوں اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ رہے ہیں کہ انہیں وہ ایک Missing Link (گم شدہ کڑی) مل جائے۔ قرآنِ کریم نے اسے بھی ''جن'' یا ''جان'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ خدا کی کیا بات ہے! چودہ سو سال پہلے قرآن نے سورۃ الحجر میں کہا کہ

---

[1] بقول تاج العروس' انگریزی زبان میں عربی کے مشہور لغت Lane's Lexicon اور سعید الخوری الشرتونی اللبنانی کی مشہور لغت اقرب الموارد اَلْاِنْس کے مطابق وہ قبیلہ ہے جو کسی جگہ مقیم ہو۔ اور اِنس کے برعکس' وہ خانہ بدوش قبائل جو جگہ جگہ پھرتے رہتے ہیں اور اس طرح عام نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں جِن کہلاتے ہیں۔ انہی کی تائید میں بقول صاحب لغات القرآن جلد اول ''عربوں میں الانس ان قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جائیں لیکن ''جن'' وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ بہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے انہیں خانہ بدوش قبائل (Nomadic Tribes) کہا جاتا ہے۔ اب بھی دنیا میں جہاں جہاں اس قسم کے قبائل پائے جاتے ہیں وہ شہر والوں سے دور دور' جنگلوں بیابانوں میں رہتے ہیں۔ شہر والوں اور اِن خانہ بدوش' صحرانشینوں کے تمدن و معاشرت' عادات و اطوار' خصائص و خصائل اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات وغیرہ میں اس قدر فرق تھا کہ یہ دونوں ایک نوع کے افراد نظر نہیں آتے تھے۔ عربوں میں یہ صحرانشین قبائل بہت زیادہ تھے۔ (انہیں بدو یا اعراب کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور صحرانشینوں سب کی طرف تھا اس لیے اس نے جِنٌ وَاِنسٌ دونوں گروہوں کو مخاطب کیا ہے۔'' (پرویز: لغات القرآن۔ ص:446)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ o وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ [1]

(15:26-27)۔قرآن کتنی واضح بات کرتا ہے یہاں ''مِنْ قَبْلُ'' نے بات واضح کردی کہ انسان کی تخلیق سے پہلے یہاں ایک ایسی مخلوق تھی جو اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔قرآن نے یہی کہا ہے کہ وہ ایک مخلوق تھی جو اب تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔

## سائنس کے انکشافات

عزیزانِ من! یہ چیز بھی سائنس کے انکشافات میں ہے کہ خود ہمارا کرّہ ارض بھی کبھی بالکل آتشیں گولا ہوتا تھا' پھر آہستہ آہستہ اس کے اوپر کا حصہ جس پہ ہم رہ رہے ہیں' ٹھنڈا ہوا جبکہ اس کے اندر ابھی تک وہی پگھلے ہوئے مادے ہیں' دھاتیں ہیں' جو گاہے گاہے آتش فشاں پہاڑ کی شکل میں نکلتے ہیں۔ جب کبھی یہ اوپر کا حصہ جو بہت گرم تھا' اس وقت اس حصے پر ایسی مخلوق' جو اس قسم کے درجہ حرارت کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی تھی' موجود تھی۔گویا اس سے پہلے زندگی کی' لائف (Life) کی ایک کڑی تھی جو' اب انسانی نگاہوں سے اوجھل ہے اور یہی ہے وہ چیز جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اُسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔اِسے ہم ''جن'' کہتے ہیں۔اس میں اتنی زیادہ شدید درجہ حرارت برداشت کرنے کی صلاحیت تھی لیکن وہ اب موجود نہیں ہے' نگاہوں سے اوجھل ہے۔غالباً یہ وہی درمیان کی Missing Link (گم شدہ کڑی) ہے جس کی تلاش میں مغرب کے یہ سائنسدان کس قدر کاوشیں اور کوششیں کر رہے ہیں۔بہرحال یہ ایک کڑی (Link) تھی جس کا ہم سے اس لیے تعلق نہیں ہے کہ وہ اب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ایک تو یہ چیز یاد رکھیے۔

## انسانی ذہن کا عہد طفولیت

عزیزانِ من! دوسری یہ بات یاد رکھیے کہ جب انسان اپنے ذہن کے عہدِ طفولیت میں تھا اور ہنوز اس کی علمی تحقیقات کی کاوشیں اتنی بلند سطح پہ نہیں پہنچی تھیں' بیشمار چیزیں ایسی تھیں جن کے متعلق وہ کچھ بھی معلوم نہیں کرسکتا تھا' خاص طور

---

[1] حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کی ابتداء سیاہ کیچڑ سے ہوئی جو سوکھ کر کھنکھنانے لگتا ہے [یعنی وہ طینِ لازب ہے جس سے زندگی کا اوّلین جرثومہ وجود میں آیا (37:11)]۔واضح رہے کہ انسانی تخلیق سے پہلے کرّہ ارض میں بے پناہ حرارت تھی اس لیے ابتداءً یہاں ایسی مخلوق کی ابتداء ہوئی جس میں حرارت برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت تھی۔وہ مخلوق اب باقی نہیں رہی۔انسان اسی کا جانشین ہے (2:30)۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

پہ اس زمانے میں جو بیماریاں ایسی آتی ہیں جن پر Scientific (سائنسی) تحقیقات کی جاسکتی تھیں تو ایسی وہ بیماریاں جن کے اسباب انہیں معلوم نہیں ہوتے تھے ان کے متعلق ان کا واہمہ تھا' تو اہم تھا' تخیل تھا۔ وہ یہ کہتا تھا کہ اس قسم کی کوئی قوتیں ہیں جو آ کر اثر انداز ہوتی ہیں' جسے کہتے ہیں کہ وہ چمٹ جاتی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بیماریاں ان کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ عام طور پر عورتوں میں ہسٹریا (Hysteria) اور مردوں میں دیوانگی' جنون' اور پاگل پن اسی قبیل سے ہیں۔ اس زمانے میں تو چیچک کا مرض' تپ دق تک کے امراض' جن کی ان کے ہاں تحقیق نہیں ہوسکتی تھی' اسی قسم کی اثر انداز ہونے والی قوتوں کی وجہ سے سمجھے جاتے تھے۔ ان امراض کی تشخیص نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ ہوتی بھی کیوں؟ اس وقت تو سائنسی تحقیق نہیں تھی۔ جہاں ان کی یہ ''کیوں'' رک جاتی تھی' وہ کہتے تھے کہ کچھ ایسی قوتیں ہیں جو آ کر انسان پہ اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے یہ امراض پیدا ہوتے ہیں۔ یہ جتنی قوتیں تھیں' ان کو چونکہ یہ نظر نہیں آتی تھیں' اس لیے انہیں بھی انہوں نے بھوت' پریت' جن' پریاں' چڑیلیں نام دے رکھے تھے' پھر وہ ان کی پرستش بھی کرتے تھے۔ پرستش کے معنی ہیں کہ وہ ان کی منتیں کرتے تھے' ہاتھ جوڑتے تھے' ان کے سامنے سجدے کرتے تھے کہ تم اس طرح سے ہمیں تکلیف نہ دو' آ گئے ہو تو چلے جاؤ۔ ان کے بڑے بڑے سیانے' جو اس زمانے میں کہلاتے تھے' وہ یہ مذہبی پیشوا ہی ہوتے تھے۔ وہ آ کر ان پہ ٹونے' ٹوٹکے' گنڈے' تعویذ کرتے تھے۔ جس قسم کے جہالت پر مبنی وہ امراض تھے اُسی قسم کے جہالت پر مبنی ان کے علاج ہوتے تھے۔ اس دور سے بھی انسان گزرتا چلا آیا تآ نکہ علم کی روشنی نے جہالت کی ان تاریکیوں کو رفتہ رفتہ دُور کیا۔ جس حد تک یہ دُور ہوتی چلی گئیں اس حد تک وہ چیزیں جو آنکھوں سے دیکھی نہیں جاتی تھیں' وہ مشہود ہونی شروع ہوگئیں۔ امراض کے اسباب معلوم ہوگئے' تشخیص ہونے لگ گئی' تو اہم پرستیوں کو علم کی روشنی نے کافور کر دیا۔ آپ ابھی کل تک یورپ کی تاریخ دیکھیے۔ وہ اس قسم کی جہالت میں' تو اہم پرستیوں میں' ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں ہر قسم کے بھوت' پریت' جن' چڑیلیں' اور امراض کے متعلق بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ آج چونکہ علم کی دنیا میں جسے Scientific (سائنسی) علم کہتے ہیں' باقی اقوام سے یہ آگے ہے' ان ملکوں کے اندر اب ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے: نہ جن ہے' نہ بھوت ہے' نہ پریت ہے' کچھ نہیں ہے حتیٰ کہ اب ان امراض کے متعلق بھی یہ کچھ نہیں ہے' جن کی وجہ سے خاص طور پہ ہمارے ہاں کی لڑکیوں کو جو ایک دورہ پڑتا ہے اور پھر جو کچھ ان بچیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے' اس سے خدا پناہ دے۔ وہ بچیاں بیمار ہوتی ہیں۔ وہ بیماری ہسٹیریا (Hysteria) ہے۔ اُس کا علاج ہے اور پھر اب انہوں نے Psychiatry (طبِ نفسی) سے علاج شروع کیا ہے۔ وہ تو بہت آگے چلے گئے ہیں۔ وہ ان چیزوں کا قوتِ خیال سے

ہی علاج کرتے ہیں کیونکہ ان امراض کا زیادہ تعلق اعصاب سے ہوتا ہے اور یہ قلندر [1] تو ہر چہ گوید دیدہ گوید ہے۔ یہ تو آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ کچھ تو میں خود کرتا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ یہ چیزیں بھی علم کی روشنی میں آتی چلی جاتی ہیں۔

قرآنِ کریم کے نزول کا مقصد خدا نے یہ بتایا تھا کہ اس کے ذریعے تم انسانیت کو تاریکیوں سے روشنی میں لے آؤ۔ یہ اس کا فریضہ تھا' اس امت کی ذمہ داری تھی کہ وہ نوعِ انسانی کو قرآن کے ذریعے تاریکیوں سے روشنی میں لے آئے لیکن بہرحال اس امت نے نہیں کیا۔ جس نے بھی یہ کیا ہے' انسانیت کے اوپر اس کا احسان ہے۔ علم کی دنیا میں جو قوم آگے بڑھی ہے' جہالت کی تاریکیاں وہاں سے رفتہ رفتہ سمٹتی چلی گئی ہیں۔ اب امراض میں بھی کوئی مرض ایسا نہیں رہا جن کے متعلق یہ کہہ نہ سکیں کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ اگر وہ بیماری Physical (جسمانی) نہیں ہوتی تو پھر وہ Psychological (نفسیاتی) ہوتی ہے۔ وہ نروس (اعصابی: Nervous) بیماری ہوتی ہے۔ یہاں تک یہ آ گئے ہیں لیکن ہم تو ابھی ساری دنیا سے پیچھے اسی سطح کے اوپر ہیں جہاں انسان اپنے عہدِ طفولیت میں ہوتا تھا۔ ہم میں علم تو ہے نہیں' سائنس قطعاً نہیں ہے' اس لیے ان چیزوں کے متعلق بھی تا حال یہی صورت ہے اور پھر اس قسم کی جو قومیں ہیں ''اوناں وچ تے ایہو جئے جن چمڑ دے نیں جیہڑے نظر نئیں اوندے ہوندے کہ گلوں لتھ دے نئیں ہیگے۔'' [2] یہ قومیں ان کو بھی برداشت کرتی ہیں جسمانی علاج کراتی ہیں یا نفسیاتی۔ تو یہ ہیں وہ قوتیں جنہیں آپ جنات کہیں گے۔

## نزولِ قرآن کے وقت آبادی کی حالت

عربوں کے ہاں زمانہ نزولِ قرآن میں اور آج بھی ان کے ہاں آبادی کی صورت یہ ہے کہ وہاں بہت تھوڑے شہر ہیں۔ آج بھی آپ عربیہ میں جا کے دیکھیے یا ان کے ہاں کی معلومات لیجیے: سارے دو تین شہر ہیں۔ آپ اسے برِاعظم کہہ لیجیے کیونکہ یہ اتنا بڑا ملک ہے۔ اس کے اندر شہر کتنے ہیں؟ دو تین شہر ہیں۔ اور یہی دو تین شہر ہیں' جن کا نام اس زمانے میں بھی ملتا ہے: مکہ' مدینہ اور طائف۔ ان شہروں میں رہنے والے لوگ جنہیں Social Animal (سماجی حیوان) کہتے ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوتے تھے۔ ان مانوس لوگوں کو وہ لوگ اپنی زبان میں ''الناس'' کہتے تھے یا ''انسان'' کہتے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ مانوس ہوتے ہیں اور ان کے ہاں کی باقی ساری آبادی خانہ بدوش' صحرا

---

[1] پرویزؒ کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔

[2] ان میں تو اس قسم کے ''جن'' چپکتے ہیں جو نظر ہی نہیں آتے' ان سے تو گلو خلاصی ہی نہیں ہوتی۔

نشین، بدو ہوتے تھے۔ کوئی اس نخلستان کے نیچے دو چار دس خیمے گاڑ لیے، ایک قبیلہ یہاں آ گیا، کوئی پچاس میل دُور کہیں اس کو نخلستان ملا اس کے نیچے اس نے اپنی ''ٹپڑ یاں جنوں کیندے نیں'' [1] ڈال لیں۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے۔ یہ خانہ بدوش تھے یعنی اپنے کندھے پہ اپنا گھر اٹھائے ہوئے پھر رہے تھے۔ یہ ہمیشہ باہر جنگلوں میں رہتے تھے، صحراؤں میں رہتے تھے، کبھی کبھار ان میں سے کوئی شہر میں آ جاتا تھا۔

## خانہ بدوش نظروں سے دُور رہنے والی مخلوق

میرا خیال ہے کہ آپ احباب، جو ہماری نسل کے ہیں، انہیں پتہ ہوگا کہ جن کو ہم خانہ بدوش کہتے ہیں ان کے ہاں کے مرد، بندر نچانے والے، ریچھ نچانے والے، شہروں میں آتے تھے اور دن بھر یہ کچھ کرتے تھے اور شام کو یہ کہیں چلے جاتے تھے۔ ان کی عورتیں آتی تھیں۔ اب ان کو میں کیسے سمجھاؤں ''گگھو گھوڑے ونچن والیاں [2] تھیں''۔ وہ یہ چھوٹی چھوٹی سی چیزیں لے کر آ جاتی تھیں اور گھروں میں، محلوں میں، بیچتی تھیں اور پھر شام کو کہیں گم ہو جاتی تھیں۔ یعنی پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ یہ لوگ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ یہ شہر سے دُور خانہ بدوش لوگ ہوتے تھے۔

عربوں کے ہاں بھی اسی قسم کے خانہ بدوش لوگ ہوتے تھے۔ ہمارے یہاں بہت کم تعداد میں یہ بات تھی کیونکہ شہری آبادیاں زیادہ تھیں۔ اُن کے ہاں چونکہ شہری آبادی بڑی قلیل تعداد میں تھی، اس لیے بیشتر آبادی انہی کی تھی۔ یہ لوگ چونکہ شہریوں کی نگاہوں سے اوجھل جنگلوں میں رہتے تھے وہ ان کو بھی ''جن'' کہتے تھے۔ قرآن میں ''جن'' اور ''انس/ الناس'' جہاں آتا ہے اس کے معنی یہ دو قسم کی آبادیاں ہیں: بدوی/ دیہی، خانہ بدوش اور شہری۔ ان دونوں کی تمدنی، ثقافتی، علمی اور عقلی سطح میں بہت فرق تھا۔ اب تو یہ خانہ بدوش بھی حتیٰ کہ گاؤں والے بھی، شہریوں کے ساتھ ایسے مل جل گئے ہیں کہ ان میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں رہا۔ آج سے بیس تیس چالیس پچاس سال پہلے ان گاؤں والوں اور شہر والوں کے تمدن میں، ان کی ثقافت میں، ان کی معاشرت میں، بڑا فرق ہوتا تھا۔ شہر والے تو ان کو گنتی میں ہی نہیں لاتے تھے۔ اک گل کیہہ دینی

---

[1] جنہیں جھونپڑیاں کہتے ہیں۔

[2] مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے اور گھوڑے نما جانور بیچنے والی عورتیں۔

''پی اے پینڈو والے۔''[1] بس معاملہ ختم ہوا۔ ہمارے ہاں دیہات اور شہر میں اتنا فرق تھا۔ شہری آبادی اور ان کے ہاں کی یہ بدوی آبادی' جو خیمہ بدوشوں کی تھی' صحراؤں میں رہنے والے۔ ان میں سے بیشتر تو وہ تھے جنہوں نے کبھی شہر دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ اس قسم کی چیزیں بنانے والے' گگھو گھوڑے[2] ہی نہیں' وہ چھوٹے چھوٹے چاقو' درانتیاں' چھاج' چھلنیاں' یہ چیز بنا کے بھی شہروں میں لاتے تھے۔ وہ عرب میں بھی یہ کچھ کرتے تھے۔ ان کا شہروں کے اندر آنا جانا صرف اس حد تک تھا' باقی اس کے بعد پھر وہ شام کو گم ہو جاتے تھے۔

عزیزانِ من! عرب تو زبان کے اعتبار سے بڑی محسوساتی قوم تھی۔ یہ جو شہر سے گم ہو جانے والے تھے' انہیں وہ ''جن'' کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں جہاں مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (114:6) آتا ہے ''جن اور ''الناس'' کے الفاظ آتے ہیں' یاد رکھیے! اس لفظ ''جن'' کے معنی ''اس زمانے کے بدو خانہ بدوش اعراب'' تھے اور ''الناس'' وہ تھے جو ''شہروں میں آباد'' ہوتے تھے۔ قرآنِ کریم میں ایک تو یہاں (72:1) سورۃ الجن میں یہ بات آئی ہے کہ ''جنوں'' کا ایک گروہ تھا۔ اس نے قرآن سنا اور اس سے بڑا متاثر ہوا۔ انہوں نے پھر آپس میں Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کی کہ ہم کیا چیز سن کر آئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایمان لائے۔ بعض تھے' جنہوں نے انکار کیا۔ اس ایک مقام پہ' سورۃ الجن' میں یہ آیا ہے' دوسرا (46:29-30) میں سورۃ احقاف میں ہے کہ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ (46:29)۔ وہاں (72:1) میں بھی یہی ہے اور یہاں (46:29) میں بھی یہی ہے' انہی کا ذکر ہے جنہوں نے قرآن سنا' اور پھر انہوں نے جا کر اپنی قوم سے کہا۔

عزیزانِ من! اس سے نظر آتا ہے کہ وہ جو آئے تھے وہ یا تو کسی طرح سے یہودی تھے یا ان کے عقائد اس قسم کے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی قوم میں یہ کہا ہے کہ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (46:30) ہم ایک ایسی کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد (محمد ﷺ پر) نازل ہوئی ہے۔ اور اس کے کلام سے نظر آتا ہے کہ حضرتِ موسیٰ کے بعد اس قسم کا کلام یہیں آیا ہے گویا انہیں یہ معلوم تھا کہ اس سے پہلے حضرتِ موسیٰ کی طرف کچھ کتاب آئی تھی اور وہ اس کتاب کو جانتے تھے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ یہ جو ہم سن کر آئے ہیں' یہ اس کتاب

---

[1] صرف یہ ایک بات کہہ دینا کہ ''یہ دیہاتی ہیں۔''

[2] مٹی کے بنے ہوئے گھوڑے اور گھوڑے نما جانور۔

کی تعلیم کی تصدیق کرتی ہے' تائید کرتی ہے' جو حضرتِ موسیٰؑ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ گویا یہاں' جو سورۃ احقاف (46:29-30) میں بتایا گیا ہے' اُس سے نظر آتا ہے کہ یہ یہودی تھے یا یہودیوں کے سے اعتقادات سے متاثر ہوئے افراد تھے۔ یہ ''جن'' تھے یعنی یہ وہی خانہ بدوش قبائل تھے' وہی نگاہوں سے اوجھل' بدوی زندگی بسر کرنے والے لوگ تھے۔ یہ آئے ہیں اور انہوں نے آ کر یہ قرآن کھلے بندوں نہیں' چھپ کر سنا ہے کیونکہ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ (72:1)[1] اللہ تعالیٰ نے اِن کو خبر دی کہ آج ان بدوی قبیلوں میں سے کوئی قبیلہ' کوئی ایک گروہ آیا تھا۔ اس نے چپکے سے' چھپ کر' قرآن سنا ہے۔ وہاں (46:29-30) میں بھی ہے اور یہاں (72:1) میں بھی ہے کہ وہ سامنے جرأت کر کے نہیں آئے بلکہ انہوں نے اس طرح سے قرآن کو سنا ہے۔ گویا ایک وہاں (46:29-30) میں ہے' ایک اس سورۃ الجن (72:1) میں بھی یہی چیز آئی ہے۔ ابھی جب میں آگے ان آیتوں میں چلونگا تو نظر آ جائے گا کہ یہ کوئی وہ ''جن'' نہیں تھے۔ جو ہمارے ذہنوں میں ہیں' یہ انسان ہی تھے' وہ اسی طرح سے کہ ان میں سے کچھ مسلمان ہوئے' بعض ایسے تھے جنہوں نے انکار کیا۔ یہ آپس میں Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کر رہے ہیں' دلائل دے رہے ہیں۔ یہ ساری باتیں وہی ہیں جو انسان کرتے ہیں۔

## رسول اکرم ﷺ صرف انسانوں کی طرف ہی مبعوث ہوئے تھے

عزیزانِ من! اب اگلی چیز یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ ان ''جنوں'' نے قرآن سنا' انہوں نے کہا' ان میں سے وہ بھی تھے جنہوں نے کہا کہ ہم خدا پہ ایمان لاتے ہیں' قرآن پہ ایمان لاتے ہیں' رسول اللہ ﷺ پر ایمان لاتے ہیں۔ تو اب یہاں سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ قرآنِ کریم نے نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہر مقام پہ یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کو انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے' کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ آپ ﷺ کو انسانوں اور ''جنوں'' کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ گویا یہ جو ایمان لائے تھے' یہ انسان ہی تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو صرف انسانوں کی طرف رسول ہیں۔ فرض کیجیے کہ اگر یہ اس قسم کی کوئی ایسی مخلوق بھی تھی تو رسول ان کی طرف مبعوث ہوئے ہی نہیں تھے۔ ان کا قرآن سن کر ایمان لانے' اتباعِ رسالت کرنے' اور اطاعت کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپؐ ان کی طرف تو رسول تھے ہی نہیں۔ آپ دو ایک ریفرنسز یعنی حوالے اس کے لیے بھی لے لیجیے۔ ایک تو (7:158) ہے جس میں ''حصر'' کے ساتھ قرآن نے یہ کہا ہے۔ ''حصر کا'' معنی

---

[1] (ارے رسولؐ!) اِن سے کہہ دو کہ مجھے بذریعہ وحی بتایا گیا ہے کہ..... (مفہوم القرآن۔ پرویز)

ہوتا ہے: بالتحقیق تمام نوع انسانی سے پکار کر کہنا' صرف انہی کو اعلان کر کے کہنا۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا (7:158)۔ اے رسول! کہہ دو: اے نوعِ انسانی! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔ عزیزانِ من! یہ الناس کی طرف ہی رسول ہیں۔ ایک اور حوالہ لے لیجیے: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ❶ (34:28)۔ اس آیت میں یہ جو وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ ہے یہ وہ ''حصر'' ہے' یہ پکار کر کہنا ہے کہ ہم نے اے رسول! تمہیں صرف انسانوں کی طرف رسول بھیجا ہے۔ تو کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ ہے۔ وہاں (7:158) میں جمیعًا تھا' یہاں کافۃ للناس (34:28) آتا ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں: تمام انسانوں کی طرف' صرف انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ نظر آ گیا کہ یہ لوگ' جنہوں نے قرآن سنا' اس پر ایمان لائے اور پھر یہ کہا کہ ہم اطاعت کرتے ہیں' تو یہ انسان ہی تھے۔ قرآن کے ان حوالوں کی بنا پر' تصریحات کی رو سے' یہ انسان تھے کیونکہ حضورﷺ تو انسانوں ہی کی طرف رسول بن کر آئے تھے' یہ وہ ''جن'' تھے جو بادیہ نشین تھے' صحراؤں میں رہنے والے خانہ بدوش تھے' جو شہری آبادیوں کی نگاہوں سے دُور رہتے تھے۔

قرآنِ کریم میں ''جن'' اور الناس کا لفظ بار بار آئے گا' تو اس کے معنی یہی ہیں کہ وہ ان دونوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تمہارے لیے یہ قوانین ہیں' یہ ہدایت ہے' یہ سب کچھ ہے۔ اگر یہ جن انسانوں میں سے نہ ہوتے تو قرآن کا یہ دعویٰ معاذ اللہ غلط ہو جاتا کہ رسول اللہ کو انسانوں کی طرف ہی رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تو یہ انسان ہی تھے جن کا ذکر' الناس اور الجن کے الفاظ میں آیا ہے۔ لہٰذا اگر قرآن کریم کی کچھ بنیادی وضاحتیں' آیات کی روشنی میں لی جائیں تو پھر اس سلسلہ میں کوئی دشواری باقی ہی نہیں رہتی۔ جہاں یہ کہا ہے کہ ''جنوں'' نے قرآن سنا' وہ ایمان لائے اور انہوں نے اس کے متعلق Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) وغیرہ بھی کی' تو یہ کسی اُس ''جن'' کا قرآن میں ایسا ذکر نہیں ہے جو چمٹ جاتا ہے۔ یہ اب ان کی تو اہم پرستیاں جو اس طرح کے تصور کو جنم دیتی ہیں' ویسے تو شہری زندگی میں بھی تو اہم پرستیاں کچھ کم نہیں ہوتیں لیکن یہ جو باہر کی خانہ بدوش ہیں' جو اس قسم کی بادیہ نشین' صحرا نشین آبادیاں ہیں' ان میں تو اہم پرستیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ان کے ہاں کے یہ جو بڑے بڑے مذہبی پیشوا ہوتے ہیں یہ لوگ اپنے ہر معاملہ میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں' وہیں سے یہ

---

❶ ہم نے' اے رسول! انہیں تمام نوعِ انسانی کی طرف اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ تم لوگوں کو بتاؤ کہ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کس قدر خوشگوار ہونگے (بشیراً) اور ان کی خلاف ورزی کرنے کے عواقب کس قدر الم انگیز ہونگے' نیز جو لوگ ان قوانین کی مخالفت میں آگے ہی آگے بڑھتے جائیں انہیں اس سے روکا جائے۔ (نذیراً) (مفہوم القرآن۔ پرویز)

تصورات آتے ہیں۔ اب بھی ان اقوام میں' ان براعظموں میں چلے جایئے' افریقہ' آسٹریلیا وغیرہ کے اندر چلے جایئے تو وہاں آپ دیکھیں گے کہ ان کا سارا دارومدار ان مذہبی پیشواؤں کے اوپر ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہر معاملے میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں' یہ اس مذہبی پیشوا کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بات کرے تو اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ یہ آسمان کی باتیں ہیں جو ہم معلوم کرتے ہیں اور تمہیں آ کر بتاتے ہیں۔ اس سے بڑا رعب پڑتا ہے اور اس کا اثر بھی بڑا ہوتا ہے۔

## علم کی روشنی سے دُور مسلمان کی حالت

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو اہم پرستیاں مسلسل ومتواتر چلی آ رہی ہیں اور وہ قوم جسے قرآن ملا تھا اور جس کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ دنیا کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آئے گی اس کی حالت یہ ہے کہ وہ آج علمی دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ وہ ابتدائی انسانوں سے آگے نہیں بڑھ پائے جنہیں میں افریقہ یا اسٹریلیا کے جنگلوں میں رہنے والے الناس سمجھتا تھا ان کے مقابلے میں آج مسلمان علم کی دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔ نیز یہ کہ سائنس کی روشنی اُن ترقی یافتہ ملکوں سے مستعار لے رکھی ہے' ان سے مانگ کے لی ہوئی ہے۔ آج انہی کی بنائی ہوئی چیزیں آپ کے ہاں موجود ہیں۔ ایک جنریٹر (Generator) ان کا بنایا ہوا نہ ہو تو ساری بجلیاں گل ہو جائیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آج کل بھی لوڈ شیڈنگ آ رہا ہے۔ ہم آج بھی تاریکیوں کی طرف جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ رمل' جفر' پیشین گوئیاں' فالیں لینا' استخارے کرنا' یہ جو ساری چیزیں ہیں' یہ آج بھی اسی عہد کی چلی آ رہی ہیں' جنہیں ہم افریقہ کے' آسٹریلیا وغیرہ کے جاہل قبائل کہتے ہیں۔ ان کے اندر یہ چیزیں آج بھی ہیں۔ ان تمام چیزوں کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ایک دانش مند' سمجھدار' آپ کو کوئی مشورہ دیتا ہے تو وہ علم کی بناء پر' ذہن کی بنا پر' بصیرت کی بنا پر' شعور اور فکر کی بناء پر' دیتا ہے۔ وہ دلیل دیتا ہے لیکن جب کوئی حضرت جی آپ کو کوئی مشورہ دیتے ہیں وہ کسی دلیل وبصیرت کی بنا پہ نہیں دیتے۔

## خدا تعالیٰ سے براہِ راست معلومات کا حصول

عزیزانِ من! ان کے ہاں کا ایک لدنی علم ہوتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا کہ یہ کیا ہے کہ جی! ہم براہِ راست اللہ میاں سے لیتے ہیں۔ یہ جتنے بھی اس قسم کے علم لدنی کے ماننے والے ہیں' وہ آسمان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ قبائلی لوگوں کے ہاں جو بڑے بڑے مذہبی پیشوا تھے' ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم' جو تمہیں بتاتے ہیں' یہ ہم

آسمان کی خبریں لاتے ہیں۔اس سلسلے میں قرآن نے' جو اگلی بات بتائی ہے' وہ بڑی علم و دانش کی ہے۔قرآنِ حکیم کی روشنی سے قبل' سرزمینِ عرب میں' ان کی تاریکیاں' ان کی تواہم پرستیاں اور ان کی جہالتوں کا عروج تھا لیکن نزولِ قرآن کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد' انہی کے اندر' انہی کے ہاں کے جو مذہبی پیشوا' اتنے اتنے دعوے کرتے تھے' آسمان کی خبریں لانے کے دعوے کرتے تھے' وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ بھئی! ٹھیک ہے' ہم اس سے پہلے تو آسمان پر جا کے خبریں لے آیا کرتے تھے لیکن اب تو ہماری کیفیت یہ ہے کہ اگر کوئی ہم میں سے وہاں جانے کی کوشش کرتا ہے تو ''علم و آگہی'' کی آگ کے ایسے شعلے برستے ہیں کہ آگے جانے کی جرأت ہی نہیں پڑتی۔کیا بات ہے!

## قرآنِ حکیم کے نور کی آگ

یہ کونسی آگ تھی جس کے شعلے پڑتے تھے؟ یہ قرآن کے نور کی آگ تھی جس کے شعلے پڑتے تھے۔وہ تو بھاگ اٹھے' انہوں نے تو یہ کچھ چھوڑ دیا لیکن نظر یہ آتا ہے کہ وہاں سے انہوں نے چھوڑا نہیں' ہماری طرف منتقل کر دیا۔وہ ساری چیزیں ہم اپنے ہاں مانتے ہیں۔ہم حضرت صاحبوں کے علم کو مانتے ہیں' ان کے علمِ لدنی کو مانتے ہیں' ان کی پیشین گوئیوں کو مانتے ہیں' اور جفر کو اور رمل کو مانتے ہیں۔ہم تو فٹ پاتھ پہ جو طوطا لے کر بیٹھا ہوا ہوتا ہے' اس کے متعلق بھی مانتے ہیں کہ قسمت کا حال بتا رہا ہے۔

## قسمت کا حال طوطے بتاتے ہیں

عزیزانِ من! اب اس قوم کی جہالت کا کیا کہنا جو انسان کی قسمت طوطے سے سن رہا ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ ان کی قسمتوں کے اوپر بھی خدا اسی قسم کے لوگ مسلط کر دیتا ہے۔جہالت سے یہی ہوتا ہے۔ ان کے ہاں تو یہ ہے کہ وہ کہہ اٹھے کہ نہیں بھئی! اب ہمارا گزارا نہیں ہے' اب وہاں آسمان سے شعلے پڑتے ہیں' ہم اب وہاں نہیں جا سکتے۔یہ ابتدا ہی ہے۔ حضور کی زندگی میں ہی قرآن کے نزول کے تھوڑا ہی عرصہ بعد جبکہ ابھی قرآن کی تکمیل بھی نہیں ہوئی ہے' تو وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں' بھئی! اب نہیں۔تو گویا قرآن کی بصیرت اور علم کی اس قدر نور پاشیاں تھیں کہ اس کے زمانہ نزول کے دوران ہی وہ لوگ یہ پکار اٹھے کہ نہیں' وہ ہماری تواہم پرستیاں تھیں جن میں ہم نے تمہیں الجھا رکھا تھا' اب وہ دَور چلا گیا ہے' اب تو اگر کوئی ہماری طرح آسمان پہ جا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا ہے' تو وہاں سے اس کو آگ کے شعلے پڑتے ہیں۔یہ وہ لوگ کہہ اٹھے' انہیں تو قرآن کی آگ کے شعلے پڑتے تھے' ہمیں نہیں پڑتے۔

ان تمہیدی کلمات کے متعلق یہ کچھ کہنا نہایت ضروری تھا جو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو قرآن میں ''جن'' آتے ہیں تو کم از کم ان کے معنی کیا ہیں۔ ان ''جنوں'' کے مروجہ مفہوم سے یہ تائید لینا کہ وہ انسانوں کو چمٹ جاتے ہیں' اس کا تو ہمارے ہاں پوچھو نہیں' جگہ جگہ آپ کے ہاں کے بڑے بڑے حضرت صاحبوں کے آستانے ہیں' ان کے ہاں ہر جگہ ''جن'' ہوتے ہیں۔

## جِنوں کے قصے

آپ میری کتاب ''تصوف کی حقیت'' میں ہی دیکھ لیجیے جو ان کے جنات کے قصے میں نے لکھے ہیں۔ پھر بار بار بیچ میں ''میں'' آتی ہے جس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اس دورِ جہالت میں تو یہ گناہگار [1] بھی ''جِن'' نکالا کرتا تھا۔ ان ''جنوں'' کے قصے تھے: حضرت صاحب کے ہاں کا ایک جن تھا' وہ ہمارے ہاں' وہاں جہاں ہم پڑھتے تھے' وہاں پہ تھا۔ یہاں اس مسجد کے اندر باقی لڑکے بھی پڑھا کرتے تھے تو ان کے ہاں ایک ''جن'' لڑکا بھی انسان کی شکل میں پڑھا کرتا تھا۔ ''جن'' تو ہر شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ''جن'' جو ہے' اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے' انسان بھی بن جاتا ہے۔ ہاں تو وہ پڑھا کرتا تھا' ایک دن مسجد کے صحن میں یہ سارے بچے ''لکن میٹی'' سمجھدے ہونا جیہڑی ہوندی ہیگی اے۔ [2] بچے کھیلتے ہیں' ایک بھاگتا ہے' دوسرے چھپتے ہیں۔ تو وہ بھاگ رہے تھے' چھپ رہے تھے۔ وہ جو جن لڑکا تھا' وہ بھاگ رہا تھا۔ اسے کہیں چھپنے کو جگہ نہ ملی' تو مسجد کے لوٹے میں جا چھپا۔ اب وہ لوٹے میں جو چھپ گیا تو باقی بچوں نے شور مچایا اور رونا شروع کر دیا۔ بڑی بات تھی جناب! اس کے بعد ان حضرت صاحب نے بچوں کو چپ کرایا اور پھر اس جن لڑکے سے کہا کہ بیٹا! اب یہ راز فاش ہو گیا ہے' اس لیے اب تم یہاں سے چلے جاؤ' پھر وہ چلا گیا۔ یہ اس مسجد کے لوٹے میں ہوا تھا جہاں ہم پڑھا کرتے تھے۔ میں پھر عرض کرونگا کہ وہ ''جن'' نکالنے تو بڑے آسان تھے' جو میں نکالا کرتا تھا' ان جنوں کو بھگانا بھی کچھ مشکل نہیں تھا مگر یہ جو انسان جن بن جاتا ہے اسکو نکالنا بڑا دشوار ہے:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا' پرانا پاپی ہے' برسوں میں نمازی بن نہ سکا [3]

---

[1] یہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف اشارہ ہے۔
[2] چھپنے اور ڈھونڈھنے کا کھیل۔ آپ اسے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک گیم ہوتی ہے۔
[3] اقبالؒ: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص۔ 306۔

## انسانی جن کو نکالنا بڑا مشکل کام ہے

یہ ''جن'' نہیں نکلتے صاحب! یہ قرآن کے علم کی روشنی سے ہی نکل سکتے ہیں۔ اور ان جنات کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ شمع نورانی اس امت کی طرف کبھی نہ آنے پائے۔ یہ انہی جہالت کی تاریکیوں کے اندر جئے اور انہی کے اندر مرتا چلا جائے: پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے۔ پختہ تر کردو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ جتنی ساری کوششیں' ہو رہی ہیں' وہ یہ ہیں کہ اسے ان تواہم پرستیوں میں پختہ تر کر دیجیے۔ وہ آپ نے طلوعِ اسلام میں دیکھا ہوگا۔ میں ان چیزوں کو کبھی کبھی لے آتا ہوں۔ ہندوستان بھر کے مفتی اعظم' پہلے وہ دیوبند کے مفتی تھے یعنی مفتی شفیع صاحب' پھر پاکستان میں مفتی اعظم ہوئے۔ ان کے ہاں کی وہ تفسیرِ قرآن آپ دیکھیے کہ یہ ان کے ہاں کی تفسیر کیسے چل رہی ہے۔ ان مفتی اعظم اور مفسر اعظم نے خود کہا ہے کہ میری بیوی پر ''جن'' کا سایہ تھا' وہ آیا کرتا تھا۔ ہمیں معلوم ہے اور ہم ان کے ساتھ یہ کیا کرتے تھے' پھر وہ منت کیا کرتے تھے یعنی ''جن'' کو تسلیم کر رہے ہیں۔ جہاں یہ کیفیت ہو کہ آپ کے ہاں کے مفسرِ قرآن اور مفتی اعظم اسے مانیں کہ وہ ''جن'' آتا تھا اور پھر اس ''جن'' کے لمبے چوڑے بڑے قصے ہیں۔ عزیزانِ من! اس قوم سے یہ ''جن'' نہیں نکل سکتے جو ذہنوں کے تراشیدہ ہیں۔ تو یہ ''جن'' اس طرح سے اپنی قوت کے زور پہ چپکتے ہیں اور ''جن'' کی قوت تو آپ جانتے ہیں کہ کیا ہوتی ہے۔ پھر جب یہ ''جن'' مذہبی مقدس پیراہن اوڑھ کر آئیں پھر تو ان کا پوچھو ہی نہیں۔ وہ تو نکل ہی نہیں سکتے۔

عزیزانِ من! اس تمہید کے بعد میں سورۃ الجن کی طرف آتا ہوں۔ اس سورۃ کی ابتدا ہوتی ہے کہ قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ (71:1) اے رسول! بتادو کہ خدا نے مجھے اس کی اطلاع دی ہے کہ ایک بادیہ نشین قبیلے کے کچھ لوگ آئے تھے اور وہ چپکے سے' چھپ کر' قرآن سن کے گئے ہیں۔ پھر اس کے بعد انہوں نے اپنے ہاں جا کر Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کی ہے۔ تو وہ چیز ہے جو وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی کیونکہ وہ تو سامنے نہیں آئے تھے اور انہوں نے قرآن کریم کو سنا۔ اب پتہ نہیں وہ کس قبیلے کے لوگ تھے جو وہاں چلے گئے۔ اب یہاں تو یہی چیز آئی ہے کہ وہ آئے اور چلے گئے۔

## روایات کے تحت سورۃ جن کے افسانے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا کہ قرآن نے تو یہ بتایا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کو تفاسیر' روایات و احادیث

کی رو سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ لی ایک آیت' اوراس کے ساتھ ہی وہاں جوسورۃ احقاف میں ''جن'' کی آیتیں ہیں' ان کی تفسیر آپ بخاری اور مسلم کی احادیث میں دیکھیے یا اِن آیات کی تفسیر ان کے ہاں جومعتبر ترین کتابیں ہیں' ان میں دیکھیے۔ ان آیات کی تفسیر میں سچ مچ کے ''جن'' کے اتنے اتنے لمبے افسانے ہیں کہ ''جن'' کب آئے تھے' کہاں آئے تھے' اوران کے ساتھ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ہیں کہ رسول اللہ نے ان کو ساتھ لے لیا تھا۔ بڑا دلچسپ افسانہ ہواور پھر وہ ہو ''جنوں'' کا' تو پوچھو ہی نہیں کہ وہ کتنا دلچسپ ہوتا ہے: رسول اللہﷺ جارہے تھے' حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو بہت جلیل القدر صحابی ہیں' ساتھ تھے۔ آپؐ نے کہا کہ تم آگے نہ بڑھنا۔ ایک دائرہ کھینچ لیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ایک حصار باندھا کرتے ہیں۔ وہ تو ہم بھی باندھا کرتے تھے۔ یہ اس خیال سے کہ ''جن'' اس کے اندر نہیں آسکے گا اور یہاں سے باہر نکلو گے تو وہ تمہیں پکڑ لے گا۔ اب بھی یہ حصار کھینچتے ہیں اور پھر اس کی سند حضور کی طرف منسوب کردی جاتی ہے کہ آپ بھی اس قسم کے دائرے کھینچا کرتے تھے چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو' باہر نہ نکلنا' ورنہ یاد رکھو! وہ ''جن'' تمہیں دبوچ لے جائیں گے' میں جنوں کی طرف جاتا ہوں اوران کو قرآن سناتا ہوں۔ پھر آپ وہاں گئے اوران کو قرآن سنایا۔ جبکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں وحی کے ذریعے یہ بات بتائی' تمہیں اس کا پتہ نہیں تھا اور یہاں کہا جارہا ہے کہ آپﷺ وہاں گئے اور وہاں جاکر ''جنوں'' کو قرآن سنایا اور آخر میں لکھا ہے کہ پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں بھوک لگی ہے تو رسول اللہﷺ نے انہیں ہڈیاں اور لید کھانے کے لیے دیں کیونکہ ''جنوں'' کی یہی خوراک ہوتی ہے۔ یہ ہے آپ کے ہاں کی روایات اور تفاسیر کی کتابوں میں ان آیتوں کی تفسیر۔ اب جو آپ کو ان کی تفسیر یہ ملے تو پھر آپ ان جنات سے انکار کیسے کردیں۔ سند مل گئی۔ اوراس کے بعد تحریر ہے کہ ''جنوں'' نے قرآن سنا اور اپنے ہاں واپس قبیلے میں چلے گئے جبکہ قرآن کہتا ہے کہ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (72:1) پھر انہوں نے وہاں جاکے آپس میں یہ Discussion (گفتگو) کی اور یہ کہا کہ ''ایک عجیب وغریب کتاب ہے جو آج ہم سن کے آئے ہیں۔'' اس آیت میں کیا ایک لفظ ہے: عَجَبًا۔ وہ لوگ (بادیہ نشین' صحرانورد' خانہ بدوش) وحی کی ماہیت کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ وحی کی رو سے جو کتاب آئے یا سنی جائے' وہ ہوتی کیسی ہے۔ وہ سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ یہاں لفظ ہے: عجبًا. عجیب لفظ ہے صاحب! عجیب کتاب ہے! یہ کتاب کیا کرتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ کتاب یَهْدِیْٓ اِلَى الرُّشْدِ [1] (72:2)۔ انکی سمجھ بوجھ کا اندازہ لگائیے کہ

---

[1] بالکل سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

اتنے ہی میں انہوں نے کہا کہ ''وہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔'' اور پھر کہا کہ فَاٰمَنَّا بِهٖ (72:2) ہم تو اس پر ایمان لے آئے۔

## ''جنوں'' کی قرآن فہمی

اب سوچیے کہ معاذ اللہ یہ لید کھانے والے' معاذ اللہ' جن کیا یہ Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) کریں گے کہ قرآن سنا اور وہاں جا کر کہنے لگے کہ عجیب وغریب چیز ہے' وہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے' ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (72:2) نہیں' بھائی! اب ہم بالکل خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ نظر آیا کہ اس سے پیشتر یہ خدا کو مانتے تھے۔ عربوں کے ہاں سارے اللہ کو مانتے تھے لیکن وہ بت پرستیوں میں' تو اہم پرستیوں میں' جنات پرستیوں میں' انہیں خدا کے شریک بناتے تھے۔ یہاں کہا کہ نہیں بھائی! اس کتاب نے ہمیں یہ سمجھایا ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا' اب ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے کیونکہ وَاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا [1] (72:3)۔ اِس سے یہ نظر آیا ہے کہ یہ عیسائی تھے کیونکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس سے پہلے مانا کرتے تھے کہ خدا کی بیوی بھی ہے' خدا کا ایک بیٹا بھی ہے' مگر اب کہتے ہیں کہ نہیں بھئی! وہ گمراہی کی بات تھی' توبہ توبہ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی بیوی ہو اور اس کے بیٹا بھی ہو۔ اب ہم یہ نہیں مانیں گے۔ گویا یہ نظر آیا کہ قرآن کی تعلیم کا حاصل یہ تھا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ انہوں نے قرآن کہیں ایک ہی دفعہ سنا ہو۔ قرآن یہ بتاتا نہیں ہے۔ وہ تو صرف ایک واقعہ کی بات بتاتا ہے۔ یہ چیز وحی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو بتاتا ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ انہوں نے یہ چیز کہیں چپکے سے سنی ہے لیکن وہاں جا کر یہ ساری Discussion (گفتگو) جو انہوں نے اپنے قبیلے کے لوگوں سے کی ہے' وہ ہے جو قرآن وحی کے ذریعے آپؐ سے کر رہا ہے اور وہ یہ بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے ہم ان گمراہیوں میں مبتلا تھے' اب ہم وہاں سے نکل آئے ہیں کیونکہ وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا [2] (72:4)۔ اس قسم کے اعتقادات کہ خدا کی بیوی بھی ہے'

---

[1] ہمارے نشوونما دینے والے کی شان بہت بلند ہے۔ اس کی نہ کوئی بیوی ہے' نہ اولاد۔ (ہمارے یہ عقائد تو ہم پرستی پر مبنی تھے جن سے ہم تائب ہوتے ہیں۔) (ایضاً)

[2] یہ جہالت آمیز عقائد' ہم میں سے کچھ بیوقوف لوگوں نے اپنے ذہن سے وضع کیے اور پھر انہیں خدا کی طرف منسوب کر دیا۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

بچے بھی ہیں' اس کے ساتھ شریک اور خدا بھی ہیں' یہ بات ہمارے ہاں عام تھی لیکن بہت بیوقوف احمق لوگ تھے جنہوں نے یہ باتیں مشہور کر رکھیں تھیں۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں کے یہ لوگ احمق تھے' یہ عقل وفکر کی بات نہیں ہے' خدا کا منزہ تصور اس کتاب کی رو سے سامنے آتا ہے۔ اس سے یہ نظر آتا ہے کہ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ اس کے بیوی اور بچے بھی ہوں۔ اس کے بعد کہا وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا [1] (72:5)۔ یہاں انس وجن دونوں آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ ہمارے ہاں کے آبادیوں کے لوگ ہوں' ہمارے ہاں کے مذہبی پیشوا ہوں' یہ بڑے بڑے پروہت اور پنڈت ہوں یا یہ شہر سے آنے والے بڑے بڑے مولوی صاحب ہوں' ہم سمجھتے تھے کہ کم از کم خدا کے خلاف یہ جھوٹ نہیں بولیں گے' کوئی جھوٹی بات خدا کی طرف منسوب نہیں کریں گے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ اَنَّا ظَنَنَّا (72:5) یہ کم از کم ایسا نہیں کریں گے تو گویا یہ ان کے پھیلائے ہوئے غلط خیالات تھے جن سے ہم لوگ متاثر ہوئے ہیں۔

## یہ سب مذہبی پیشوائیت ہی کا پروپیگنڈا تھا

پھر آگے کہا کہ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (72:6) ہوتا یہ رہا ہے کہ اِدھر اُدھر آبادیوں میں ہمارے کچھ اخلاط ہونا شروع ہو گیا۔ شہری آبادیوں کے لوگ اِدھر آتے تھے۔ ہمارے ہاں کے جو بڑے بڑے لوگ تھے' ان کے ہاں مہمان رہتے تھے' ان سے ملتے جلتے تھے۔ انہوں نے یہ خیالات پھیلائے' انہوں نے اس کی ابتداء کی' اور پھر اس کے بعد یہ بات بڑھتی چلی گئی۔ جبکہ حقیقت میں یہ سب افسانے ہی افسانے تھے اس کے باوجود بات آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ انہوں نے کہا کہ وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (72:7) وہ لوگ جن میں یہ خیالات پھیلائے گئے تھے' وہ بھی ہماری طرح یا تمہاری طرح یہ سمجھتے تھے کہ اب کوئی پیغمبر وغیرہ نہیں آئے گا' جو تعلیم ہمارے ہاں پیچھے سے چلی آ رہی ہے بس وہی آخری تعلیم ہے' اسی لیے اسی تعلیم کا ماننا' خدا کی طرف سے وحی کا ماننا' یا خدا کی کتاب کا ماننا ہے کیونکہ عقیدہ یہ پھیلایا گیا تھا کہ اب پیغمبر نہیں آئے گا۔ لیکن ہم نے یہ دیکھا ہے کہ یہ کتاب جو ہم سن کر آئے ہیں یہ تو بہت آگے چلی گئی ہے۔ یہ پیغمبر ہے جس کی یہ کتاب ہے۔

---

[1] حالانکہ ہم (سادہ لوح) یہ خیال کرتے تھے کہ انسان' خواہ شہری ہوں یا صحرائی' کم از کم خدا کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ (ایضاً)

عزیزانِ من! اب آگے وہ بات ہے جو میں نے کہا تھا کہ ہمارے وہ کاہن' پروہت اور منتری' اپنی کہانت' نجوم اور تواہم پرستیوں میں کہتے تھے کہ اس سے پہلے تو تم لوگ ہم سے آ کے اپنی قسمتیں پوچھا کرتے تھے' اپنی اپنی تقدیروں کے احوال پوچھتے تھے' ہم دعوی کیا کرتے تھے کہ ہم آسمان سے جا کے یہ خبریں لاتے ہیں پھر وہ تمہیں آ کے بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں کہا کہ وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا (72:8) اب تو قرآن کے سامنے آ جانے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ آسمان کی خبریں لانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اب تو ہماری صورت یہ ہے کہ آسمان کے اندر پہنچنا تو ایک طرف' اگر کہیں اس کو چھو بھی جائیں تو وہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں بڑے بڑے سخت پہرے دار ہیں۔ وہاں تو آگ کے شعلے برستے ہیں' وہ ہمیں آگے ہی نہیں جانے دیتے۔ وَاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ط فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (72:9) اِس سے پہلے ہم یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہم گھات میں بیٹھ کر آسمانی باتیں سن لیتے ہیں لیکن اب جو کوئی سننے کی کوشش کرتا ہے' اپنے سامنے (علم و برہان کے) شعلے دیکھتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ پہلے ہم تمہیں کہا کرتے تھے کہ ہم تو وہاں جا کر آسمانوں پر گھات میں بیٹھے رہتے تھے' کمیں گاہوں میں چھپ کر' چوری چوری' ہم وہاں سے' یہ باہر جو آسمان کی خبریں تھیں' ہم ان کو سن لیتے تھے اور سن کر پھر تم سے آ کر کہتے تھے کہ یہ ہوا اور وہ ہوا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جتنے بھی مذہبی پیشوا بنتے ہیں وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ہم خدا کیطرف سے یہ علم پاتے ہیں اور اس علم کی رو سے یہ باتیں تمہیں بتاتے ہیں۔ جو ہم بتا رہے ہیں یہ دعویٰ ہوتا ہے' اسی میں ان کی عظمت ہوتی ہے۔ کہا کہ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ہم وہاں جا کر آسمانوں پہ' کمین گاہ میں' بیٹھتے تھے اور چوری چھپے ہم وہاں سے جو وہاں آسمان کی باتیں ہوا کرتی تھیں سنتے اور تمہیں آ کر بتاتے تھے۔ یہ عقیدہ تھا کہ قسمتیں اور تقدیریں آسمانوں پر متعین ہوتی ہیں تو وہ کہتے تھے کہ وہاں سے ہم سن پاتے تھے۔ بس اتنا ہی تھا کہ وہ بعد میں یہاں پہنچتی تھیں' ہم پہلے آ کر تم لوگوں کو بتا دیا کرتے تھے لیکن اب اگر کوئی اس قسم کی کوشش کرتا ہے تو سن رکھو! وہ جھوٹ بولتا ہے' اب وہاں کوئی کسی کو نہیں بیٹھنے دیتا' اب کوئی وہاں سے خدائی علم کی بھنک تک اپنے کان میں لے کر نہیں آتا' یہ نہیں ہو سکتا۔

## یہ سب تو ہم پرستیوں پر مبنی جہالت کی باتیں ہیں

عزیزانِ من! آپ اب دیکھتے ہیں کہ قرآن کی سورۃ الجن میں ''جن'' کے لفظ سے ہم سمجھتے تھے کہ بس اس میں وہ

ساری توہم پرستیاں ہونگی جو ہماری قوتِ متخلیہ نے جنات کے ساتھ وابستہ کر رکھی ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں' وہ ایسا ہوتے ہیں' وہ یہ صورت ہوتی ہے۔سورۃ الجن ان توہم پرستیوں کومٹانے کے لیے آرہی ہے۔اس نے نہ صرف یہ کہ جنات کا اس قسم کا وجود ہے' جس قسم کا ہمارے ذہنوں کے اندر ہے' اسے مٹایا بلکہ پیشن گوئیاں کرنا' قسمت کا حال بتانا اورعلم لدنی کی چیزیں' جوعقائد کی بنا پر ہم لیے آرہے ہیں' انہیں بھی اس سورۃ نے مٹادیا۔وہ دورِ جہالت کی بات تھی جس میں ہم یہ کچھ کہا کرتے تھے اورتم لوگوں سے منوالیا کرتے تھے' اب وہ دَور گیا۔اب تو اگر وہاں کوئی جانے کا ارادہ بھی کرتا ہے' کہیں کوئی کوشش بھی کرتا ہے تو وہاں سے تو بڑی مار پڑتی ہے۔اب وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔اس خوبصورت انداز میں' ان تمام باطل عقائد کی' توہم پرستیوں کی' قرآن نے تردید کر کے رکھ دی ہے۔

قرآنِ کریم نے اگلی ہی آیت میں کہا کہ وَاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَبِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَــدًا [1] (72:10)۔جو کچھ ہم لوگوں نے خدا کے متعلق کیا ہے' وہ ہم نہیں جان سکتے۔اس سے تو یہ نظر آتا ہے کہ تباہی آجائے گی کیونکہ خدا کے خلاف اتنی بڑی جرأتیں کرنا' اس قسم کے جھوٹے افسانے خدا کی طرف منسوب کرنا' اس قسم کے عقائد وضع کر کے ان کو خدا کی تعلیم بتانا' یہ کوئی چھوٹا جرم نہیں ہے' یہ بڑا ہی سنگین جرم ہے۔نظر تو یہ آتا ہے کہ اس سے تو واقعی تباہی آئے گی لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد آیا ہم نے ان عقائد سے توبہ کر لی یا ان سے باز آ گئے' نہیں کہہ سکتے کہ اس کے بعد خدا ہمارے ساتھ کیا کرے گا یا ان لوگوں کے ساتھ کیا کرے گا جو یہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے مذہبی پیشوا ہیں۔ یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا وہ ان کو تباہ و برباد کرے گا یا ان کی یہ توبہ کی بازگشت قبول کرلے گا۔ وَاَنَّـا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِکَ ؕ کُـنَّـا طَرَآئِقَ قِدَدًا (72:11) یہ ٹھیک ہے کہ ہم میں اب بھی کچھ لوگ تو وہ ہیں جو ایمان لانے کے بعد صالحین بن گئے ہیں' ان کے اعمال صالح ہیں' نیک اعمال ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسرے انداز کے ہیں' جو ابھی صالحین تک نہیں پہنچے' بس انہیں بین بین کہہ لیجیے یا ابھی ان میں فاسقین بھی ہیں یعنی ہم نے اپنے ہاں متفرق طریقے اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ سب کے سب ایک ہی طریق پر ہوں۔ پہلے تو ہم سب کے سب ایک ہی طریق پر تھے خواہ وہ باطل کا طریقہ تھا۔اب ان میں سے بعض صحیح طریقے پہ آ گئے ہیں اور بعض ابھی تک اسی پرانے طریقے پر ہیں۔ اس سے باہمی تصادم کا

---

[1] ہم نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس انقلاب کا' جس کا پیامبر قرآن ہے' ردعمل کیا ہوگا۔کیا لوگ اس کی مخالفت کر کے' تباہ وبرباد ہوں گے' یا یہ صحیح راستے پر آ کر' خیر وبرکت سے ہم کنار ہوں گے۔ (مفہوم القرآن۔پرویز)

بھی امکان ہے جس کا نتیجہ خوں ریزی ہوگا۔ ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ خدا کا اقتدار اس قدر زبردست ہے کہ وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (72:12) ہم نہ تو اسے اپنے ملک میں شکست دے سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے بھاگ کر کسی ایسی جگہ جا سکتے ہیں جو اس کے حیطہ ادراک سے باہر ہو۔

## خدا کے قانون کے ساتھ مقابلہ

خدا کا قانونِ مکافات ہر جگہ موجود ہے۔ اس طرح اب ہمیں یہ یقین ہے کہ غلط طریق کے جو تباہ کن نتائج ہوتے ہیں وہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے آتے ہیں۔ ان کو کوئی نہیں روک سکتا' ان کو کوئی ناکام نہیں کر سکتا اور نہ ہی ان کی حدود سے بھاگ کر کہیں اور جا سکتا ہے۔ کتنے صحیح عقائد چلے آ رہے ہیں! لہٰذا یہاں رہ کر تو دو ہی طریقے ہوتے ہیں کہ یا تو خدا کے ساتھ (یعنی خدا کے قانون کے ساتھ) مقابلہ کریں اور اُسے شکست دیدیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہو سکتا یا دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے دائرہ کار سے باہر چلے جائیں۔ دنیا کی سلطنتوں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی ایک مملکت کے اندر گرفت کا خطرہ ہوتا ہے تو وہاں سے کسی طرح دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ وہاں گرفت کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہاں کہا کہ نہیں' اس کی مملکت تو زمین و آسمان کو گھیرے ہوئے ہے' اس سے نکل کر' بھاگ کر بھی' کہیں نہیں جا سکتے اور کہیں کھڑے ہو کر بھی اس کو شکست نہیں دے سکتے۔ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔ ہم تو اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ ان قوانین کا تسلیم کرنا ہی باعثِ عافیت ہے۔ وَاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓی اٰمَنَّا بِهٖ [1] (72:13) اور ہماری تو صورت یہ ہے کہ ہم نے وہ صحیح راستے کی طرف لے جانے والی تعلیم کو سن لیا' ہم اس پہ ایمان لائے۔ فَمَنْ يُّؤْمِنْ م بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا [2] (72:13) اور ہم یہ جانتے ہیں کہ جو بھی خدا کے اس راستے پہ ایمان لے آئے تو نہ تو اس کے حقوق میں کوئی کمی ہوگی اور نہ ہی اس کو ذلیل کیا جائے گا۔

قرآن نے بتایا ہے کہ ذلیل ہونا خدا کا عذاب ہے عزیزانِ من! اس سے انسان بچ سکتا ہے۔ وَاَنَّا مِنَّا

---

[1] یہ وجہ تھی کہ ہم نے جب اس ہدایت (قرآن) کو سنا تو ہم اس کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ (مفہوم القرآن۔ پرویز)

[2] ہمیں یقین ہے کہ جو کوئی بھی خدا پر ایمان لے آتا ہے' اسے نہ اپنے حقوق میں کمی یا سلب ونہب کا احتمال ہو سکتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ذلت ورسوائی کا خوف۔ اِسے اس کے اعمال کا پورا پورا نتیجہ ملے گا اور وہ عزت وسربلندی کی زندگی بسر کرے گا۔ (ایضاً)

الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ (72:14) اور ہم پھر اقرار کرتے ہیں کہ ہم میں وہ بھی ہیں جو خدا کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ابھی تک اس سے سرکشی برتے ہوئے ہیں۔ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِکَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (72:14) اور جو خدا کے قوانین کے سامنے جھکا ہے اور پھر صحیح راستے کی طرف جانے کے لیے وہ سرگرمِ عمل ہوتا ہے' تو یہی ہے وہ جو رشد و ہدایت کے حصول کے لیے عزیمت مندانہ قصد کرتا ہے۔ اس طرح اگلی بات صرف ایمان لانا ہی نہیں ہے بلکہ سرگرمِ عمل ہونا بھی ہے۔ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَکَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (72:15) اور وہ جو ان قوانین سے سرکشی برتتے ہیں تو پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہوتا ہے۔ یوں کہیے کہ وہ اس جہنم کے ایندھن ہوتے ہیں جو تباہ کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیا کرتا ہے۔

عزیزانِ من! وہ جو قرآن سن کر گئے تھے' ان کی اپنے قبیلے میں جو Discussion (گفتگو' تبادلہ خیال) ہوئی تھی' قرآن نے اسے یہاں تک کوٹ (حوالہ Quote) کر دیا ہے۔ اس کے بعد پھر اگلی بات خدا کی بات شروع ہوتی ہے۔ آج ہم سورۃ الجن کی آیت پندرہ تک آ گئے۔ خدا کی وہ بات ہم سولہویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀.....❀❀❀.....❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# نقد و نظر

## بایزید یلدرم (ناول)

صابر صدیقی صاحب کا نام طلوع اسلام کے حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ طلوع اسلام ٹرسٹ سے ان کی دو کتابیں ''ابلۂ مسجد'' اور ''کن فیکون'' شائع ہو کر قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں اور اسی سلسلے کی ایک کتاب کا مسودہ ''آئینۂ آئینۂ پرویزیت'' کتابت ہونے کے بعد چھپنے کا منتظر ہے۔ زیرِ نظر کتاب ان کا ایک تاریخی ناول ہے جو انہوں نے بہت محنت سے لکھا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ صابر صدیقی صاحب مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ مصور بھی ہیں یوں جب ایک مصور نثر لکھتا ہے تو قدرتی طور پر وہ رنگوں کی بجائے الفاظ سے پینٹنگز بناتا چلا جاتا ہے۔ زیرِ نظر ناول ترکی کے سلطان مراد اور ان کے بیٹے سلطان بایزید یلدرم کے زمانہ کی خالص تاریخ ہے۔ جسے چند رومانی یا نظریاتی اضافوں کے ساتھ ایک ناول کا پلاٹ تیار کر لیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمام تاریخی ناولوں کے برعکس اس ناول کا ہیرو ایک ناکام ہیرو ہے لیکن اپنی ناکامی کے باوجود وہ قاری کی نظر میں محترم رہتا ہے۔ ناول نگار خود جغرافیہ دان ہے اس لئے نہ تو اس نے لق و دق صحراؤں میں دریا بہائے ہیں اور نہ ہی خشک چٹانوں سے چشمے جاری کئے ہیں بلکہ دریائے ڈینیوب سے درہ دانیال کا جزیرہ نمائے بلقان کا علاقہ اور وہاں ترکی کی مشرقی سرحدوں کے علاقے کو اس طرح بیان کیا کہ جیسے انہوں نے خود اس علاقہ کو دیکھا ہو۔ مصنف نے جنگوں کا نقشہ کچھ ایسا کھینچا ہے جیسے آج کل میڈیا والے اپنے کیمرے لئے وارداتیں دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ ناول اس زمانہ کی تاریخ پر مبنی جب مسلمانوں کو اندلس کی سرزمین سے باہر دھکیلا جا رہا تھا اور مشرقی یورپ میں ترکوں کی یلغاروی آنا کے ایوانوں پر دستک دینے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس زمانہ میں سپین کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک میں اس یلغار کو روکنے کے لئے جو سازشیں ہوئیں وہ آج بھی مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہیں۔ ان سازشوں میں سب سے بڑی سازش تیمور کا ترکی پر اس وقت حملہ تھا جب ترک افواج دریائے ڈینیوب کے کنارے خیمہ زن تھیں۔ اگر تیمور اس وقت بایزید پر حملہ نہ کرتا تو ہوسکتا ہے کہ اس وقت مشرقی یورپ پر مسلمان چھائے ہوئے ہوتے۔ بعض حلقے تیمور کو اچھا بھی سمجھتے ہیں' مصنف نے قاری کو تیمور کا اصل چہرہ دکھایا ہے جو مسلمان ہوتے ہوئے مسلمانوں کے لئے چنگیز اور ہلاکو سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مصنف نے تاریخی شواہد پر علامہ اقبال کے اس شعر کی تصدیق کی ہے کہ

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یہ ناول جو کہ 332 صفحات پر مشتمل ہے ادارہ طلوع اسلام سے رعایتی قیمت -/150 روپے میں دستیاب ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ''یومِ مئی''

حیاتؔ رضوی امروہوی

یہ ظلم و جور کا قصہّ جو داستان میں ہے
یہ سلسلہ ہے سلاسل کا جو لگان میں ہے

ہزار وحشتوں اور دہشتوں کے ڈیرے ہیں
کوئی بھی ہے، جو کہیں بھی، کسی امان میں ہے

ہر ایک ''صنفِ عمل'' 1؎ چاہتی ہے مزدوری
درانتی اور ہتھوڑا تو بس نشان میں ہے

معاوضہ تو فقط منحصر ہے محنت پر
سعیٰ 1؎ کا لفظ ہے، قرآن کی زبان میں ہے

یہ محنتوں کا شجر ہے کہ پُرسکوں ہے بشر
گھنی ہے چھاؤں، سکوں کیسا سائبان میں ہے

فلاح رمز ہے، انساں کی محنتوں کا ثمر
فلاح 2؎ کا ہے یہی لفظ جو اذان میں ہے

سلام ان پہ ہو جو پاسباں تھے محنت کے
شکاگو والوں کا یہ تذکرہ جہان میں ہے

کہ چھ عظیم سپوتوں نے وار دی تھی حیاتؔ
سوا صدی کا یہ قصہّ ہے جو بیان میں ہے

1؎ لیس للانسان الا ماسعیٰ کی آیت قرآن میں ہے جس کی رو سے انسان محنت کے معاوضہ کے علاوہ کچھ نہیں لے سکتا۔ 2؎ حی علی الفلاح اذان کے الفاظ ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# یکے از مطبوعات باغبان ایسوسی ایشن

باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو **''قرآن فہمی اور باغبانی''** ہے۔عصرِ حاضر میں مسلمانوں میں وحدت قیادت نہ ہونے کے سبب اغیار ہمیں جدا جدا کر کے مار رہے ہیں۔ باغبان ایسوسی ایشن نے فیصلہ کیا ہے کہ مسلمانوں میں وحدت اقتدار (خلافت) کے سلسلہ میں مقابلہ مضمون نویسی کا انعقاد کیا جائے۔اس سلسلے میں کچھ اشتہار پہلے بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔مقابلہ مضمون نویسی کا عنوان:

## ﴿قیام خلافت کی راہ میں کون حائل ہے﴾

اس مقابلہ میں مضمون کا پہلا حصہ فکرِ اقبالؒ کی روشنی میں اور دوسرا حصہ حالات حاضرہ کی روشنی میں ہونا چاہئے جو کہ 5 صفحات سے کم نہ ہو۔مضمون کے لئے یہ شرط بھی ہوگی کہ وہ پہلے قومی پریس میں شائع ہو چکا ہو۔اس سے یہ فکری تحریک اور تیز ہوگی۔ پہلا انعام ایک ہزار روپے نقد اور دوسرا انعام 800 روپے ہوگا۔ایک عام 5 سطری تجویز جو جامع اور مؤثر ہو اس پر 500 روپے انعام دیا جائے گا۔شائع شدہ مضامین کی درجہ بندی کے لئے جج پینل تشکیل دے دیا گیا ہے۔ یہ تمام حضرات باغبان ایسوسی ایشن کے تاحیات ممبر ہیں۔

(1) ملک عبدالمسجود' ایم۔اے۔بی۔ایڈ' مری (2) ملک فضل عالم' بی۔اے' راولپنڈی

(3) راجہ محمد صغیر' بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی' قانونی مشیر' مری (4) محمد اشفاق عباسی' ایم۔فل' مری۔

**شائع شدہ مضامین وصول کرنے کی آخری تاریخ مع فوٹوسٹیٹ شناختی کارڈ 30 جون 2009ء مقرر ہے۔**

**تقسیم انعامات 14 اگست 2009ء کو ہوگی۔**

☆☆☆☆☆☆☆

پتہ رابطہ: **(1) ملک حنیف وجدانی' صدر باغبان ایسوسی ایشن' سنبل سیداں' نیومری۔**

**(2) صبینہ یاسمین' سینئر نائب صدر' باغبان ایسوسی ایشن' ٹبی سیداں' سوہاوہ' جہلم۔**

**(3) تنویر صادق' نائب صدر' باغبان ایسوسی ایشن' مکان نمبر 6/18' گلی نمبر 1' میاں چنوں' خانیوال۔**